معارف کا زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ساٹھ روپے   فی شمارہ پانچ روپے

پاکستان میں سالانہ ایک سو پچاس روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پندرہ پونڈ یا چوبیس ڈالر

بحری ڈاک پانچ پونڈ یا آٹھ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

- سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARUL MUSANNBFIN SHIBLI ACADEMY AZAMGARH

- رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

کمیشن ۲۵٪ ہوگا ——— رقم پیشگی آنی چاہیے۔

جلد ۱۵۵ ماہ شعبان المعظم ۱۴۱۵ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۹۵ء عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

"ہندوستانی معاشرہ وثقافت کو ہندوستان بالخصوص گجرات کے صوفیہ کی دین" کے موضوع پر احمد آباد کی درگاہ حضرت پیر محمد شاہ میں ۴ تا ۶ دسمبر کو ایک سمینار ہوا، اس میں خاکسار کے علاوہ پروفیسر نذیر احمد (علی گڑھ) پروفیسر امیر حسن عابدی پروفیسر نثار احمد فاروقی ڈاکٹر شریف حسین قاسمی ایرانی سفارت خانے کے دو نمائندے (دہلی)، ڈاکٹر عبدالرحیم (ناگپور) اور ڈاکٹر اعجاز احمد مدنی (بمبئی) تشریف لائے تھے، احمد آباد اور اس کے مضافات کے متعدد اصحاب علم نے جن میں بعض ہندو بھی تھے کارروائی میں حصہ لیا، جناب ضیاء الدین ڈیسائی کی رہنمائی اور پروفیسر نذیر احمد و پروفیسر عابدی کی رائے و مشورہ سے ہونے والے اس سمینار سے تصوف کی قدر و قیمت بھی ظاہر ہوئی اور ہندوستان کے باشندوں کی نفع رسانی اور اس کی ثقافت و معاشرت پر صوفیائے کرام کے اثرات کا اندازہ بھی ہوا، راقم نے اپنے حقیر مقالہ میں گجرات میں مسلمانوں کی آمد اسے علمی اور تہذیبی برتری عطا کرنے نیز احمد آباد کے بعض صوفیہ کے حالات اور ان کی علمی، ادبی اور ثقافتی دین کا تذکرہ کیا تھا۔

احمد آباد سلاطین گجرات کا پایۂ تخت تھا، مغلوں نے بھی اس کی مرکزیت باقی رکھی اسکے چپہ چپہ پر ان کے نقوش ثبت ہیں، اب بھی درگاہوں، مزاروں اور مسجدوں کا یہ شہر زبان حال سے انکی عظمت و جلال کی داستان سُنا رہا ہے لیکن یہ آثار و مشاہد دیکھ کر میرے دل میں درد کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا، قوموں کی زندگی میں عروج و زوال اور نشیب و فراز کے مرحلے آتے رہتے ہیں لیکن مسلمانوں کی پستی اس حد کو پہنچ گئی ہے کہ اپنے معابد کے تحفظ کا بھی ان کو یارا نہیں رہا، یہ بھی کم عبرتناک امر نہیں ہے کہ مقابر کی رونق نے مساجد کو بے نور کر دیا ہے، اہل قبور سے دعائیں اور مرادیں مانگنے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے مگر خدائے واحد کے سامنے جھکنے والے عنقا ہوتے جا رہے ہیں، توحید مسلمانوں کا طغرائے امتیاز ہے مگر وہ مشرکانہ اعمال و رسوم کی تہوں میں لپیٹ دی گئی ہے، سمینار کے اختتام کے بعد

جناب محی الدین بمبئی والے نے اپنا قیمتی وقت صرف کر کے احمد آباد اور دہلی کی یادگاریں اور درگاہ پیر محمد شاہ کے کتبخانہ کے مخطوطات دکھائے جس کے لیے انکا بہت ممنون ہوں۔

دوسرا سمینار ۲۴ تا ۲۶ دسمبر کو خدا بخش لائبریری پٹنہ کے زیر اہتمام اس کی صد سالہ سالگرہ کے سلسلے میں نیشنل میوزیم دہلی میں ہوا، اس کا افتتاح صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے کیا، لائبریری کے چیرمین ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی گورنر بہار نے خیر مقدمی کلمات ارشاد فرمائے اور ڈائرکٹر ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے شکریہ ادا کیا، اس موقع پر ملک کے ہر گوشہ کے علاوہ ایران، ازبکستان اور نیپال کے مندوبین اور دہلی کے مختلف طبقوں کے عمائد و اہل علم موجود تھے، سمینار ان ہندوستانی مذاہب کے بارے میں ہوا جن کا ظہور و شیوع ہندوستان میں ہوا، کتب خانہ خدا بخش نے جامعہ ہمدرد دہلی، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی وغیرہ کے کتب خانوں کے تعاون سے سمینار کے موضوع سے متعلق قدیم کتابوں کی نمائش کی تھی جن میں دارالمصنفین کی کتاب "ہندوستان عربوں کی نظر میں" بھی تھی، نمائش کا افتتاح بھی صدر جمہوریہ نے کیا۔

مقالات خوانی کے آٹھ جلسے ہوئے جن کی صدارت جناب سلمان خورشید، مرکزی وزیر سید حسن برنی سابق گورنر ہریانہ، محمد شفیع قریشی گورنر مدھیہ پردیش، مسٹر وسنت ساٹھے ڈاکٹر کرن سنگھ سابق گورنر جموں و کشمیر نے کی۔ دوسرے سشن کی صدارت کے لیے نجمہ ہبۃ اللہ ڈپٹی چیرمین راجیہ سبھا اور پانچویں کے لیے بشمبر ناتھ پانڈے سابق گورنر اڑیسہ نہ تشریف لاسکے تو راقم الحروف اور نواب رحمۃ اللہ خاں شیروانی نے ان کی قائم مقامی کی، مقالہ خوانوں کی تعداد زیادہ تھی، اس لیے انہیں اپنے مقالوں کا خلاصہ ہی پیش کرنا پڑا، راقم نے عرب مصنفین کے حوالے سے ہندوستانی مذاہب و فرق، انکے عقائد، رسوم، قوانین اور حدود و تعزیرات کا خلاصہ دو چار منٹ میں بیان کیا، ہر مقالہ پر مذاکرہ بھی ہوا، سمینار اپنے مقصد، مقالات کی کیفیت و کمیت، شرکا کی تعداد اور ممتاز اشخاص کے مباحثوں میں حصہ لینے

کے اعتبار سے کامیاب رہا البتہ پٹنہ میں ہونے والے لائبریری کے سیمناروں جیسی روایتی خوش انتظامی یہاں نہیں تھی جو محسوس کی گئی۔

کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے ملک اور اس کے علوم و فنون، یہاں کی زبانوں اور مذاہب سے کوئی دلچسپی نہیں علامہ شبلی اور دارالمصنفین کی کتابوں میں اس کی مدلل تردید کی گئی ہے، خدا بخش لائبریری کا اقدام قابل تعریف ہے کہ اس نے ہندوستانی مذاہب کے متعلق اردو، فارسی، عربی اور دوسری زبانوں میں ہونے والی کاوشوں کو کنگھالنے کا موقع فراہم کیا گو اس حیثیت سے مسلمانوں کی خدمات اظہر من الشمس ہیں مگر ان کے نزدیک کسی مذہب و تہذیب میں رنگ جانا اور غلط کو غلط اور صحیح کو صحیح نہ کہنا رواداری نہیں ہے بلکہ وہ اسلام کو دین حق اور دعوتی و تبلیغی مذہب سمجھتے ہیں اور یہ تقاضائے فطرت ہے کہ آدمی جس چیز کو صحیح سمجھے اس کی دعوت دوسروں کو بھی دے اس لیے اسلام کی دعوت و اشاعت رواداری کے خلاف نہیں ہے بلکہ دوسروں کو زبردستی مسلمان بنانا اور کسی مذہب کی تحقیر و مذمت رواداری کے خلاف ہے، اس نکتہ کو مدنظر نہ رکھنے کی وجہ سے بعض لوگ مسلمانوں کے بارے میں عجیب غلط فہمیوں میں مبتلا رہتے ہیں۔

اسلامک ڈیولپمنٹ بینک جدہ میڈیکل اور انجینیرنگ کے مسلمان طلبہ و طالبات کو وظائف دیتا ہے جن کی اسلامی تربیت کے لیے ماہانہ اور سالانہ اجتماعات بھی ہوتے ہیں، ہندوستان کے شمال مغرب کے طلبہ کی تربیت کے ذمہ دار مولانا ڈاکٹر ابوالحیات اشرف (دہلی) ہیں، انکی دعوت پر اس سال پانچ روزہ تعلیمی و تربیتی پروگرام ہمدرد پبلک اسکول تعلیم آباد نئی دہلی میں ہوا جس میں اسلامی موضوعات اور مسلمانوں کو درپیش مسائل پر قدیم و جدید تعلیم یافتہ حضرات نے اردو اور انگریزی میں لکچر دیے، راقم نے ۲۹ دسمبر کو اسلام کے عقیدہ رسالت کی ضرورت و اہمیت بتا کر اسے عقلی طور پر ثابت کرنے کی کوشش کی اور اسکے متعلق طلبہ کے سوالات کے جواب دیے۔

مقالات

امام رازیؒ کی تفسیر کبیر میں ربط آیات[1]

از

ضیاء الدین اصلاحی

فن تفسیر میں سب سے زیادہ کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن قدما کی تصنیفات ناپید ہیں، زمانۂ مابعد کا جو سرمایہ ہے گو بظاہر بہت کچھ ہے، لیکن علامہ شبلیؒ فرماتے ہیں۔

"درحقیقت ایک ہی نغمہ ہے جو مختلف سازوں سے ادا ہوتا ہے، آٹھ سو برس کی وسیع مدت میں ہزاروں لاکھوں اہل فن پیدا ہوئے لیکن ان تمام قالبوں میں ایک ہی روح کام کر رہی ہے، عام طریقہ سے الگ کسی نے کچھ کہا تو اشاعرہ کے حسن ذوق پر اس کی قربانی چڑھا دی گئی" (مقالات شبلی ج ۴ ص ۲۲)

قرآن مجید کی تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے مرویات بہت کم ہیں، تابعین و تبع تابعین کے اقوال تفسیر کو روایات کا نام دے دیا گیا ہے، انہی کا مجموعہ امام ابن جریرؒ کی تفسیر ہے، اس کے بعد کی اکثر تفسیریں اسی کا خلاصہ یا التقاط ہیں۔ ان منقولی تفسیروں کے مقابلے میں جو معقولی تفسیریں لکھی گئی تھیں ان میں معتزلہ کی تفسیریں زیادہ اہم تھیں مگر ان کے معدوم ہو جانے سے اب موجود تفسیروں میں

---

[1] یہ مقالہ نظم قرآن پر ماہ اکتوبر ۹۴ء کو مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں ہونے والے سیمنار میں پڑھا گیا۔

امام ابن جریرؒ کی تفسیر کی طرح اگر کسی تفسیر کو نمائندہ کہا جا سکتا ہے تو وہ امام رازیؒ ہی کی تفسیر ہے جو تفسیر کبیر کے نام سے مشہور ہے، لیکن خود امام صاحب نے اسکا نام مفاتیح الغیب رکھا تھا، یہ گویا اپنے سے پہلے کی تفسیروں کا مجموعہ ہے اور ان پر اضافہ بھی، یہاں تک کہ معتزلہ کی نایاب تفسیروں کا بڑا حصہ بھی اس کی بدولت محفوظ ہو گیا ہے، علامہ شبلی لکھتے ہیں:

"فن تفسیر کی سب سے بڑی کتاب، جو عقلی مذاق پر لکھی گئی تھی اور جس میں قرآن مجید کو عقل سے تطبیق دی تھی۔ ابو مسلم اصفہانی (المتوفی ۳۲۲ھ) کی تفسیر ہے، یہ چودہ[14] جلدوں میں ہے اور امام رازی سے پہلے وہی تفسیر کبیر کے نام سے پکاری جاتی تھی، یہ تفسیر آج اگرچہ بالکل ناپید ہے لیکن امام رازی کے زمانہ تک موجود تھی، امام صاحب اکثر اس سے مدد لیتے ہیں اور جا بجا بے اختیار اس کی تعریف کرتے ہیں، چنانچہ سورۂ آل عمران کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

وابو مسلم حسن الکلام فی التفسیر،	اور ابو مسلم کا کلام تفسیر میں عمدہ
کثیر الغوص علی الدقائق واللطائف	ہوتا ہے اور وہ تہہ میں ڈوب کر
	خوب خوب لطائف و دقائق نکالتا ہے۔

اسی انداز کی دوسری تفسیر کعبی کی تھی جس نے ۳۱۹ھ میں وفات پائی، یہ تفسیر بھی جیسا کہ کشف الظنون کا بیان ہے ۱۲ جلدوں میں تھی، کعبی مشہور متکلم تھا اور اسی مذاق میں تفسیر لکھی تھی۔

ابو مسلم اور کعبی دونوں معتزلی تھے اور گو امام رازیؒ نے اپنی تفسیر میں معتزلہ کو خاص طور پر معرکہ آرائی کے لیے منتخب کیا ہے اور اس فرقہ کے مقابلہ میں اپنی تمام

طاقت صرف کر دیتے ہیں تاہم اس وقت تک مسلمانوں میں انصاف پسندی کا مادہ موجود تھا اور اس فلسفہ سے واقف تھے۔

ع متاع خوش زہر دکان کہ باشد" (مقالات شبلی ج ۴ ص ۲۲)

امام رازیؒ کی تفسیر کا انداز تمام تفسیروں سے الگ ہے اس لیے اہل منقول نے اس کو پسند نہیں کیا۔ اس کے اغلاط و عیوب پر مستقل کتابیں لکھی گئیں اور تقلید پسندوں نے اس پر بڑی نکتہ چینی کی، مشہور تو یہ ہو گیا ہے کہ کل شئ فیہ الا التفسیر یعنی تفسیر کبیر میں ہر چیز ہے صرف ایک تفسیر نہیں ہے۔

مگر امام رازی کے اردو سوانح نگار مولانا عبد السلام ندوی مرحوم نے اسے ظلم کہا ہے اور یہ لکھا ہے:

"امام صاحب کی تحقیقی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جس مسئلہ پر لکھتے ہیں اس کے متعلق جس قدر مباحث ان سے پہلے پیدا ہو چکے ہیں ان سب کا استقصا کر دیتے ہیں، اسی اصول کے مطابق انہوں نے تفسیر کبیر لکھی ہے اور تفسیر کے متعلق ان کے دور سے پہلے جو کچھ لکھا گیا تھا ان سب کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے، اس لیے ان کی تفسیر میں نحوی، صرفی، ادبی، عقلی اور متکلمانہ ہر قسم کے مباحث موجود ہیں اور انہی میں وہ باتیں بھی شامل ہیں جن کو خالص تفسیر کہتے ہیں۔" (امام رازی ص ۴۷)

لیکن اس میں شبہ نہیں کہ امام ابن جریرؒ کی تفسیر کی طرح اس میں بھی رطب و یابس ہر قسم کی چیزیں آگئی ہیں مگر اس کے باوجود دونوں کو مسلمانوں میں حسن قبول نصیب ہوا۔ مولانا عبد السلام ندوی کے استاد محترم علامہ شبلیؒ رقمطراز ہیں:

"اگرچہ جیسا کہ ان کا عام انداز ہے وہ وسعت بیان اور تبحر علمی کی رو میں رطب و یابس کی

تمیز نہیں کرتے اور سیکڑوں ایسی اوچھی اور سرسری باتیں لکھ جاتے ہیں جو انکے رتبے کے بالکل شایان نہیں ہوتیں تاہم ان حشو و زوائد کے ساتھ سیکڑوں ایسے دقیق اور معرکۃ الآرا مسائل حل کیے ہیں جن کا کسی اور کتاب میں نام و نشان بھی نہیں ملتا۔" (الکلام، ص ۷۷)

تفسیر کبیر کے متعلق ابھی مزید باتیں عرض کیے جانے کے لائق ہیں مگر تمہید کو زیادہ طول دینا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

امام رازیؒ نے اپنی تفسیر میں نظم کی جو کیفیات بیان کی ہیں وہ عموماً ربط آیات یا دو آیتوں کے باہمی تعلق کی جانب اشارات ہیں تاہم کہیں کہیں پوری سورہ یا اس کے بڑے اور اہم حصے کے نظام پر بھی بحث و گفتگو کی ہے، اگر یہ ساری مثالیں اکٹھا کی جائیں تو ایک مفید رسالہ تیار ہو سکتا ہے، ہم اختصار کے خیال سے صرف پہلی دونوں سورتوں (فاتحہ اور بقرہ) سے ایک ترتیب کے ساتھ مثالیں پیش کریں گے۔

امام صاحب نے تفسیر کا معتد بہ اور زیادہ حصہ خود لکھا ہے تاہم بہت تھوڑا حصہ دوسروں کا لکھا ہوا ہے، فاتحہ اور بقرہ کی سورتوں کی تفسیر کا ان کے قلم سے ہونا قطعی ہے۔

سورۂ فاتحہ سے مستنبط ہونے والے عقلی اسرار بیان کرتے ہوئے امام صاحب لکھتے ہیں کہ الحمد للہ سے دو باتوں کا پتہ چلتا ہے، ایک تو اللہ تعالیٰ کے وجود کا اور دوسرے اس کے مستحق حمد و ثنا ہونے کا۔ مؤخر الذکر کے ثبوت میں وہ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ سے اس طرح اپنا استدلال پیش کرتے ہیں:

"بندہ دنیا میں یا تو سلامتی اور سعادت کی حالت میں ہوتا ہے یا تکلیف والم مقبر

اور مکروہات میں گرفتار ہوتا ہے، اگر وہ پہلی حالت میں ہوتا ہے تو اس کے اسباب اللہ کے خلق، تکوین و ایجاد کے بغیر حاصل نہیں ہوتے اس بنا پر وہ رحمٰن و رحیم ہوا اور اگر بندہ مکروہات و آفات کی حالت میں ہو تو مکارہ و آفات یا تو بندوں کی جانب سے ہوں گی یا اللہ تعالیٰ کی جانب سے۔ اگر بندوں کی جانب سے ہوں تو اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے کہ جزا کے دن وہ مظلوموں سے انصاف کرے گا اور ظالموں سے انکا بدلہ لے گا اور اگر یہ آفات و مکروہات اللہ کی جانب سے ہوں تو اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اپنے بندوں پر دنیا میں جو آفات و بلیات نازل کرے گا ان پر ان کو بڑا اجر و ثواب دے گا۔ اس سے لازماً یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ بے نہایت حمد اور بے نہایت ثنا کا مستحق ہے۔"

یہ ثابت کرنے کے بعد امام صاحب لکھتے ہیں:

فظهر بالبيان الذی ذكرناه ان قوله الحمد لله رب العلمين الرحمن الرحيم مالك يوم الدين مرتب ترتيبا لا يمكن فی العقل وجود كلام اكمل وافضل منه

ہماری تذکرہ بالا وضاحت سے ظاہر ہو گیا کہ الحمد للہ رب العالمین الرحمٰن الرحیم مالک یوم الدین ایسا مرتب و مربوط کلام ہے جس سے بہتر اور مکمل کلام کا وجود عقلاً ممکن نہیں ہے۔"

پھر فرماتے ہیں:

"اللہ نے ربوبیت الٰہی کی معتبر صفات پر گفتگو مکمل کرنے کے بعد عبودیت پر گفتگو کی ہے، دراصل انسان جسد و روح کا مجموعہ ہے اور جسم ان اشیا کے حاصل کرنے میں جو روح کے لیے نفع بخش ہیں آلہ ہوتا ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جسم کی بہ

افضل و برتر حالت یہ ہے کہ وہ ایسے کام کرے جو باقی رہنے والی روحانی سعادتوں
کے لیے معین و مددگار ہوں۔ اس طرح کے جسم کے وہی اعمال ہو سکتے ہیں جو معبود
کی تعظیم اور اس کی خدمت پر دلالت کریں، انہی اعمال کو عبادت کہا جاتا ہے
اس لیے اس دنیا میں انسان کی سب سے بہتر حالت یہ ہے کہ وہ عبادات پر
مداومت و مواظبت کرے اور یہی انسان کی سعادت کا اولین درجہ ہے جو
ایاک نعبد کا مقصود و مراد ہے، جب انسان اس درجہ پر ایک مدت تک
مواظبت اختیار کرتا ہے تو ایسے موقع پر اس کے لیے عالم غیب کے کچھ انوار
ظاہر ہوتے ہیں، جس کی توضیح اس طرح ہے کہ آدمی براہ راست ان عبادات
و طاعات کو انجام نہیں دے سکتا جب تک کہ اس کو اللہ کی توفیق، اعانت
اور عصمت نہ حاصل ہو جائے۔ یہ کمالات کا اعلیٰ درجہ ہے جو ایاک نستعین
کی مراد ہے، جب وہ اس مقام سے آگے بڑھتا ہے تو اس پر یہ حقیقت منکشف
ہوتی ہے کہ ہدایت اللہ ہی کی جانب سے حاصل ہوتی ہے اور مکاشفات و تجلیات
کے انوار ہدایت الٰہی کی بدولت حاصل ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد
اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ سے یہی مراد ہے اور اس میں بعض لطائف ہیں۔"
امام صاحب کی اس عارفانہ و فلسفیانہ تشریح سے چاہے کسی کو اتفاق ہو یا اختلاف
لیکن اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ وہ سورۂ فاتحہ کی تمام آیتوں کو باہم مربوط و
منظم خیال کرتے ہیں

اب آیئے سورۂ بقرہ کی تفسیر پر ایک نظر ڈالی جائے۔

أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ — یہی لوگ اپنے رب کی ہدایت پر ہیں

وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ — اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں

(بقرہ : ۲-۵)

کے متعلق فرماتے ہیں کہ اس میں پہلا مسئلہ اس آیت کے ماقبل سے تعلق کی کیفیت کا ہے،
اس کی تین۳ صورتیں ہیں۔

۱۔ مبتدا اَلَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ ہو، اس کی توضیح اس طرح کی ہے کہ جب
هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ کہا گیا تو ان کے لیے کتاب کا ہدایت ہونا خاص ہو گیا، ایسی صورت میں کوئی
شخص یہ سوال کر سکتا ہے کہ متقیوں کے لیے اس کے خاص کیے جانے کا سبب کیا ہے
اس لیے اَلَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ سے أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ تک کی آیات
اسی سوال کا جواب ہیں، گویا یہ کہا جا رہا ہے کہ جو لوگ ایمان، اقامت صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ
اور فوز و فلاح اور نجات سے اشتغال رکھنے والے ہیں وہ لازماً اپنے خداوند کی
جانب سے ہدایت پر قائم ہیں۔

۲۔ اَلَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ کو مبتدا نہ مانا جائے بلکہ اسے متقین کے
تابع و متعلق بنایا جائے اس طرح مبتدا أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ہوگا، گویا بات
یوں کہی گئی ہے کہ کیا سبب ہے کہ ان اوصاف سے متصف لوگ ہدیٰ سے مختص کیے گئے
ہیں تو جواب دیا گیا کہ عام لوگوں سے قطع نظر اس طرح کے اوصاف و خصوصیات کے
مالک لوگوں کا دنیا میں ہدایت اور آخرت میں فلاح پانا غیر مستبعد ہے۔

۳۔ پہلے موصول کو متقین کی صفت قرار دیا جائے اور دوسرے کو مبتدا ہونے
کی وجہ سے مرفوع اور اولئک کو اس کی خبر مانا جائے، اس صورت میں فلاح و ہدایت
سے انکا اختصاص ان اہل کتاب پر تعریض ہوگی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت

پر ایمان نہیں لائے ہیں اس کے باوجود ان کا گمان یہ ہے کہ وہ ہدایت پر ہیں اور ان کی طمع یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں فلاح پائیں گے۔ (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۱۷۹)

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى	اللہ تعالیٰ نے انکے دلوں پر اور انکے
سَمْعِهِمْ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ	کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی
غِشَاوَةٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ	آنکھوں پر پردہ ہے اور انکے لیے
(بقرہ: ۲-۷)	عذاب عظیم ہے۔

کے متعلق امام رازی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ اس سے پہلے والی آیت (اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ الخ) میں اللہ تعالیٰ نے یہ واضح کیا تھا کہ وہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے، اس آیت میں اس سبب کو بتایا ہے کہ جس کی وجہ سے وہ ایمان نہیں لائے اور یہ سبب ختم (مہر لگا دینا) ہے (ج ۱ ص ۱۸۹)

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا الخ (بقرہ: ۲۱) کے تحت لکھتے ہیں:

"ان آیات میں چند مسائل ہیں، پہلا مسئلہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے تینوں جماعتوں یعنی مومنین، کفار اور منافقین کے احکام پہلے بیان کیے تھے تو اب ان سب کی طرف خطاب فرمایا ہے اور یہ طریقہ اسی التفات کے باب سے تعلق رکھتا ہے جس کا ذکر اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ میں آیا ہے (ج ۱ ص ۲۱۱)

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ الخ (بقرہ ۲۳) کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"جان لو کہ اللہ تعالیٰ نے جب اثبات صانع کے دلائل قاہرہ قائم کر دیے اور اپنے شریک اور ساجھی ہونے کی بات باطل قرار دے دی تو اس کے بعد نبوت پر دلالت کرنے والے امر کو بیان کیا اور اس سے فرقہ تسلیمیہ کے قول کا فاسد ہونا

ثابت ہوتا ہے جنھوں نے معرفت الٰہی کو معرفت رسول سے مستفاد قرار دیا ہے اسی طرح فرقہ حشویہ کے قول کا باطل ہونا بھی ثابت ہوتا ہے اور چونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت قرآن کے معجزہ ہونے پر مبنی ہے اس لیے اللہ نے قرآن کے معجزہ ہونے پر دلیل قائم کی ہے۔" (ج ۱ ص ۲۲۳)

الکلام علی المعاد کے زیر عنوان سورۂ بقرہ کی پچیسویں آیت (وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا الخ) کے متعلق رقمطراز ہیں:

"جب اللہ تعالیٰ توحید و نبوت پر گفتگو کر چکا تو ان دونوں کے بعد اس نے معاد پر بحث کی ہے اور (چوبیسویں آیت میں) کافر کی سزا اور (اس آیت میں) مطیع و فرمانبردار کے ثواب کو بیان کیا اور یہ عادۃ اللہ ہے کہ وہ جب کسی آیت میں وعید کا ذکر کرتا ہے تو اس کے بعد ایسی آیت لاتا ہے جس میں وعدہ و بشارت کا ذکر ہوتا ہے۔" (ج ۱ ص ۲۳۰)

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖۤ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا الخ (۲۶) کے متعلق لکھتے ہیں:

"جب اللہ نے قرآن مجید کے معجزہ ہونے کی دلیل بیان کی تو یہاں ایک شبہ کا ذکر کیا ہے جو کفار قرآن مجید میں قدح کے خیال سے پیش کرتے تھے، شبہ یہ تھا کہ قرآن مجید میں نحل، ذباب، عنکبوت اور نمل کا ذکر آیا ہے اور یہ سب چیزیں ایسی ہیں جو فصحا کے کلام میں لائق ذکر نہیں ہوتیں، اس لیے قرآن مجید کا ان پر مشتمل ہونا اس کے اعجاز تو درکنار اس کی فصاحت کو بھی داغدار کر دیتا ہے، پس اللہ تعالیٰ نے اس کا یہ جواب دیا کہ ان چیزوں کا معمولی ہونا قرآنی فصاحت کے لیے موجب قدح نہیں ہے کیونکہ انکا ذکر نہایت بلیغ حکمتوں کا متضمن ہے،

یہی اس آیت کے ماقبل آیت سے تعلق کی کیفیت کی جانب اشارہ ہے۔"

(جلد ۱ ص ۲۴۴)

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا الخ (۲۸) کے سلسلے میں ارشاد فرماتے ہیں:

"ابھی تک توحید، نبوت اور معاد کے دلائل پر بحث کی گئی تھی اب یہاں سے يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الخ سے پہلے تک ان نعمتوں کی شرح و تفصیل کی گئی ہے جو تمام مکلفین کے لیے عام ہیں اور یہ نعمتیں چار ہیں پہلی احیا (زندگی عطا کرنے) کی نعمت ہے جس کا اس آیت میں ذکر ہے۔" (ج ۱ ص ۲۵۶)

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ الخ (۲۹) کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

"یہ دوسری نعمت ہے جو تمام مکلفین کے لیے عام ہے، غور کرو یہ کس قدر عمدہ ترتیب ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے لحاظ کیا ہے کیونکہ زمین و آسمان سے نفع اندوز ہونا زندگی کے حاصل ہونے کے بعد ہی ہو سکتا ہے، اسی لیے اللہ نے پہلے زندگی کے معاملہ کا ذکر کیا ہے پھر اس کے بعد آسمان و زمین کا ذکر ہے۔" (ج ۱ ص ۲۵۸)

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ الخ (۳۰) کے تحت لکھا ہے:

"یہ آیت حضرت آدمؑ کی خلقت اور ان کی اس عظمت و کرامت کی کیفیت پر دلالت کرتی ہے جو اللہ نے ان کو دی ہے۔ اس طرح یہ بھی تمام بنی آدم پر اس کا ایک عام انعام ہوا، گویا یہ عام نعمتوں میں سے تیسری نعمت ہے جس کا یہاں ذکر کیا گیا ہے۔" (ج ۱ ص ۲۶۲)

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا الخ (۳۴) کے متعلق ارقام فرماتے ہیں:

"تمام نوعِ انسانی پر عام نعمتوں کے سلسلے میں یہ چوتھی نعمت ہے کہ اللہ نے ہمارے باپ حضرت آدمؑ کو ملائکہ کا مسجود بنایا ہے اسی لیے اس نے پہلے تو ان کے خلافت سے سرفراز کیے جانے کی تخصیص کا ذکر کیا پھر ان کے علم کثیر سے مالا مال ہونے کی خصوصیت بیان کی تیسرے نمبر پر علم میں ان کی اس درجہ تک رسائی و بلوغ کا ذکر کیا جہاں تک پہنچنے سے ملائکہ عاجز و درماندہ ہیں اور اب یہ ذکر ہو رہا ہے کہ حضرت آدمؑ ملائکہ کے مسجود ہوئے (ص ۲۹۸)

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا الخ (۳۸) کے بعد یہ آیت وارد ہے وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا الخ (۳۹) امام رازی دونوں کو اس طرح مربوط بتاتے ہیں کہ:

"جب اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی اتباع کرنے والوں کے عذاب اور حزن سے مامون رہنے کا وعدہ کیا تو اس کے بعد ان لوگوں کا بھی ذکر کیا جن کے لیے اس نے دائمی عذاب تیار کیا ہے خواہ یہ انسان ہوں یا جنات" (ص ۳۲۴)

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا الخ (۴۰) کی تفسیر سے پہلے انھوں نے اَلْقَوْلُ فِي النِّعَمِ الْخَاصَّةِ بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ کا عنوان قائم کیا ہے پھر آیت زیر بحث کا نظم اس طرح بیان کیا ہے:

"اللہ تعالیٰ نے پہلے توحید، نبوت اور معاد کے دلائل بیان کیے، ان کے بعد ہر بشر پر ہونے والے عام انعامات کا تذکرہ کیا اور اس کے بعد یہود کے اسلاف پر کیے جانے والے مخصوص انعامات اس لیے بیان کیے کہ ان کو یاد دلا کر ان کی ضد، عناد اور کٹ حجتی کا خاتمہ کر دے اور ان انعامات کی وجہ سے ان کے قلوب میں میلان اور انابت کی کیفیت پیدا ہو اور یہ نبوت محمدی پر ان کے لیے تنبیہ کا

کام بھی دے، کیونکہ وہ انہیں اس کی خبر دے رہا ہے۔ جان لو کہ پہلے اللہ نے ان نعمتوں کا تذکرہ علی سبیل الاجمال اس طرح کیا کہ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الخ اسی تذکیر پر متفرع کرکے انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا حکم دیا اور کہا کہ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ پھر اللہ نے ان چیزوں کو بیان کیا جو آپ پر ایمان لانے سے ان کے لیے مانع ہو رہی تھیں، اس کے بعد دوبارہ پھر ان کو اجمالاً یہ کہہ کر انہیں وہی نعمتیں یاد دلائی ہیں کہ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ الخ اس سے ان کی شدید غفلت پر متنبہ کرنا مقصود ہے۔ اس تذکیر کے بعد یہ بلیغ اور موثر ترغیب آتی ہے کہ وَاَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ جس کے ساتھ ہی یہ بلیغ و موثر ترہیب بھی شامل ہے کہ وَاتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْـًٔا الخ پھر اس کے بعد ان نعمتوں کو تفصیلاً گنانا شروع کیا۔ جو غور و خوض کرے گا اور انصاف سے کام لے گا وہ جان لے گا کہ یہی نہایت خوبصورت اور عمدہ ترتیب ہے۔" (ص ۴۳۳)

یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْ الخ (۴۰) کے بعد مندرجہ ذیل تین آیتیں ہیں۔

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ الخ (۴۱) وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ الخ (۴۲) وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ الخ (۴۳)

امام صاحب ان کے ربط و نظم کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"پہلے تو اللہ تعالیٰ نے ایمان کا حکم دیا ثانیاً حق کو باطل سے گڈمڈ کرنے اور دلائلِ نبوت کو چھپانے سے روکا اس کے بعد ان شرائع کو بیان کیا جو ان پر لازمی اور ضروری تھے۔ اول ان میں سے ان شرائع کا تذکرہ کیا جو مقدم اور بنیادی تھے، یعنی نماز جو تمام بدنی عبادات میں سب سے عظیم ہے اور زکوٰۃ جو تمام مالی عبادات میں سب سے عظیم

ہے۔" (ص ۴۴۴)

اس کے بعد آیت (۴۴) اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ الخ کے سلسلے میں کہتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے ایمان و شرائع کا حکم ان نعمتوں کی بنیاد پر دیا ہے جن کے مورد خاص طور پر بنی اسرائیل تھے اور انہیں ان کی طرف راغب کرنے کے لیے انہیں بنیاد بنایا ہے۔ دوسروں کو اعمالِ بر کی تلقین و ترغیب کے باوجود خود ان سے غافل رہنا عقلاً بہت قبیح اور معیوب بات ہے کیونکہ لوگوں کو اعمالِ خیر کا حکم دینے سے مقصود یا تو خیر خواہی ہے یا شفقت، اس لیے عقل کسی طرح اس کو باور نہیں کر سکتی کہ آدمی غیر پر تو شفقت کرے یا غیر کی بھلائی و خیر خواہی میں رہے اور خود اپنے کو اس سے الگ رکھے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس پر شدید تحذیر کی ہے۔" (ص ۴۴۵)

اس کے بعد آیت (۴۵) وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ الخ میں مخاطب کی تعیین میں مفسرین کے دو قول بتائے ہیں، پہلا قول یہ ہے کہ مخاطب وہ لوگ ہیں جو رسولؐ پر ایمان لا چکے ہیں کیونکہ جو لوگ سرے سے نماز اور دین محمدؐ پر صبر کے منکر ہوں ان سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ صبر اور نماز سے مدد چاہو اس لیے لازماً خطاب انہی لوگوں سے ہے جو آپ کی تصدیق کرتے ہیں، یہ کوئی اشکال نہیں ہے کہ بنی اسرائیل کے سلسلۂ بیان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں سے خطاب کس طرح ہو گیا، مگر امام صاحب کے نزدیک قرین صواب یہ ہے کہ مخاطب بنو اسرائیل ہیں انہی کے الفاظ میں

لان صرف الخطاب الی غیرهم یوجب تفکیک النظم۔

کیونکہ بنی اسرائیل کے سوا کسی اور کی جانب خطاب کا رخ پھیرنا نظم کلام کو درہم برہم کر دینے کا موجب ہوگا۔

اب رہا یہ سوال کہ بنی اسرائیل کو صبر و صلوٰۃ کا کیسے حکم دیا جا سکتا ہے جبکہ وہ ان چیزوں کے منکر تھے تو امام رازی صاحب فرماتے ہیں کہ ہم اس کو تسلیم نہیں کرتے کہ وہ صبر و نماز کے منکر تھے کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ جن چیزوں پر صبر کرنا ضروری ہوتا ہے ان پر صبر کرنا نہایت عمدہ بات ہے، رہی نماز جو خالق کے سامنے تواضع اور فروتنی اور ذکر الٰہی میں مشغولیت سے عبارت ہے تو یہ دنیا کی آزمائشوں اور آفات و بلیات میں تسلی بخشتی ہے، اختلاف اس کی کیفیت میں ہے کیونکہ یہود کی نماز کی کیفیت دوسری طرح پر ہے اور مسلمانوں کی نماز کی کیفیت دوسری طرح ہے اور جب متعلق امر وہ ماہیت ہے جو قدر مشترک ہے تو مذکورہ اشکال زائل ہو گیا، اسی بنا پر ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جب انہیں ایمان کا حکم دیا، ضلالت و غوایت ترک کر دینے کی تاکید کی اور شرائع یعنی نماز و زکوٰۃ کے التزام کی دعوت دی اور یہ تمام چیزیں ان پر بہت گراں گزریں کیونکہ اسکی وجہ سے ان کو ریاست ترک کرنی اور مال و جاہ سے اعراض کرنا پڑ رہا تھا تو اللہ نے اس بیماری کا علاج تجویز کیا اور فرمایا کہ صبر اور نماز سے مدد چاہو (ص ۳۴۰)

آیت (۴۹) وَاِذْ نَجَّیْنٰکُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ الخ کے بارے میں لکھتے ہیں :

"پہلے بنی اسرائیل پر اللہ نے اپنی نعمتیں اجمالاً بیان کی تھیں، اب ان کی قسموں کو تفصیلاً بیان کر رہا ہے تاکہ تذکیر و حجت زیادہ بلیغ و موثر ہو، اس آیت میں پہلے انعام کا تذکرہ ہے۔" (ص ۳۵۹)

آیات وَاِذْ فَرَقْنَا بِکُمُ الْبَحْرَ الخ (۵۰) وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰی الخ (۵۱) وَاِذْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ (۵۳) میں علی الترتیب دوسرے، تیسرے اور چوتھے انعامات کی نشاندہی کی ہے اور وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ الخ (۵۴) کے سلسلے میں یہ لکھتے ہیں کہ :

"یہ پانچواں انعام ہے، بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ اور اس کے بعد کی آیت کا تعلق نعمتوں کی تذکیر کے مقدم بیان سے نہیں ہے کیونکہ اس میں قتل کا حکم مذکور ہے اور قتل نعمت نہیں ہے، مگر امام صاحب نے چار وجہوں سے اس بات کو کمزور ثابت کیا ہے۔" (ج ۱ ص ۳۶۰)

اسی طرح آیات وَاِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی الخ (۵۵) اور ثُمَّ بَعَثْنٰکُمْ الخ (۵۶) میں وہ چھٹے انعام کو چھ وجہوں سے ثابت کرتے ہیں (ج ۱ ص ۳۶۹) وَظَلَّلْنَا عَلَیْکُمُ الْغَمَامَ الخ (۵۷) میں ساتویں انعام کا مذکور ہونا بیان کرتے ہیں۔ (ج ۱ ص ۳۷۲)

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْیَةَ الخ (۵۸) کے متعلق لکھتے ہیں :

"یہ آٹھواں انعام ہے، یہ آیت بھی ان آیتوں سے جڑی ہوئی ہے اور اس کا عطف بھی انہی پر ہے جن میں متقدمہ نعمتوں کا تذکرہ تھا کیونکہ جس طرح اللہ نے اپنی نعمتوں کو بیان کیا کہ تم پر بدلیوں کا سایہ کیا اور من و سلویٰ اتارے اور یہ سب دنیوی انعام تھے تو ان کے پیچھے ان پر اپنے وہ انعامات بھی بیان کیے جن کا تعلق ابواب دین سے ہے چنانچہ انہیں اس چیز کا حکم دیا جو ان کے گناہوں کو محو کرنے اور اس سزا و عقوبت سے ان کو چھٹکارا دلادے جس کے وہ مستوجب ہوئے تھے۔" (ج ۱ ص ۳۷۲)

وَاِذِ اسْتَسْقٰی مُوْسٰی الخ (۶۰) کے متعلق فرماتے ہیں :

"بنی اسرائیل کو گنائے جانے والے انعامات میں سے یہ نواں انعام ہے جو دنیا و دین کی نعمتوں کا جامع ہے۔"

دنیا کی نعمت ہونے کو وہ اس طرح واضح کرتے ہیں کہ :

"اگر تیہ میں اللہ ان کی پانی کی شدید ضرورت کو زائل نہ کرتا تو وہ اسی طرح ہلاک ہو جاتے جس طرح من و سلویٰ نہ اتارے جانے سے ہلاک ہوتے، معتاد پانی کے انعام کے مقابلہ میں تیہ میں پانی کا انعام اس لیے بہت بڑا اور عظیم ہے کہ جنگل و بیابان میں اس کی سخت احتیاج ہوتی ہے، اب ایسی جگہ جہاں پانی اور نباتات کا کوئی تصور نہیں ہو سکتا تھا اور پانی کی جانب سے لوگوں کی ساری امیدیں منقطع ہو گئی ہوں تو اگر اللہ تعالیٰ پتھر پر لاٹھی مارنے سے پانی مہیا کر دے تو اس کے برابر اور کون سی نعمت ہو سکتی ہے، رہا اس کا دینی نعمت ہونا تو وہ اس طرح ہے کہ اس میں صانع کے وجود، اس کی قدرت اور علم کے کھلے دلائل پنہاں ہیں اور یہ حضرت موسیٰؑ کی سچائی کی بھی دلیل ہے۔" (ص ۳۷۶)

وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ الخ (۶۳) اور ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِکَ (۶۴) میں وہ دسویں انعام کی نشاندہی کرتے ہیں (ص ۳۸۴)

ان انعامات کے بعد آیت (۶۵) وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِیْنَ اعْتَدَوْا مِنْکُمْ الخ کا ذکر کر کے ان سے اس کا تعلق اس طرح واضح کیا ہے:

"پہلے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر اپنے یہ انعامات گنائے ہیں اور اس سلسلہ کا خاتمہ ان پر کی جانے والی بعض تشدیدات کے ذکر پر کیا ہے، زیر بحث آیت میں اسکی پہلی نوع کا ذکر ہے۔"

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُکُمْ الخ (۶۷) سے فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا الخ (۷۳) میں وہ تشدیدات کی دوسری نوع کی تعیین کرتے ہیں۔

اس کے بعد آیات ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُکُمْ (۷۴) اور اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ یُّؤْمِنُوْا لَکُمْ (۷۵)

کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"جب اللہ نے یہود کے اسلاف کے قبیح افعال پہلے بیان کیے تو یہاں سے اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے یہود کے اعمال قبیحہ کا ذکر شروع کیا ہے۔"

(ج ۱ ص ۳۹۹)

وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (۷۶) میں وہ آنحضرتؐ کے زمانے کے یہود کے قبیح افعال کی دوسری نوع کی صراحت کرتے ہیں اور وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ (۸۰) میں وہ ان کے اقوال و افعال قبیحہ کی تیسری نوع کا مذکور ہونا بیان کرتے ہیں۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْ اِسْرَآءِیْلَ (۸۳) کے بارے میں لکھتے ہیں:

"جن نعمتوں سے اللہ نے بنی اسرائیل کو خاص طور پر بہرہ ور کیا تھا ان کی انواع میں سے یہ دوسری نوع ہے اس کی وضاحت اس طور پر ہے کہ جن باتوں کا انہیں مکلف بنایا گیا ہے وہ سب سے بڑی نعمت جنت تک پہنچانے والی ہیں اور جو چیز نعمت تک پہنچانے والی ہو وہ بھی نعمت ہے، اس طرح یہ تکلیف بھی لامحالہ نعمت ہوئی۔" (ج ۱ ص ۴۲۰)

وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ لَا تَسْفِکُوْنَ دِمَآءَکُمْ (۸۴) میں بھی اسی طرح کی تکلیفی نعمت بتائی ہے (ج ۱ ص ۴۲۴)

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ الخ (۸۷) کے متعلق لکھتے ہیں:

"یہود پر کی جانی والی نعمتوں کی یہ دوسری نوع ہے مگر اس کے مقابلہ میں انہوں نے کفر اور قبیح اعمال اختیار کیے جیسا کہ اس سے پیشتر کی آیات (۸۵ و ۸۶) میں ان کا یہ حال بیان ہوا ہے کہ انہوں نے اپنوں کو قتل کر کے اور اپنے ہی

ایک گروہ کو ان کی بستیوں سے نکال کر خدا کے حکم سے سرتابی کی اور اپنی اس حرکت سے دنیا کو آخرت پر ترجیح دی۔ اس آیت میں ان کی مزید تبکیت و رسوائی کا ذکر ہے۔"
(ج ۱ ص ۴۲۷)

آیات وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ (۸۹) اور وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا (۹۱) کے بارے میں بتایا ہے کہ یہ یہود کے قبیح اعمال کی ایک نوع تھی (ج ۱ ص ۴۳۰ و ۴۳۳) اسی طرح آیات قُلْ إِن كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْآخِرَةُ (۹۴) (ج ۱ ص ۴۳۴ و ۴۳۵)، وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَىٰ حَيَاةٍ (۹۶) (ص ۴۳۰)، قُلْ مَن كَانَ عَدُوًّا (۹۷) (ص ۴۳۸) اور وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُو الشَّيَاطِينُ (۱۰۲) (ص ۴۴۳) میں بھی بتایا ہے کہ قبیح افعال و اعمال اور منکر اور بیہودہ اقوال وغیرہ کی انواع کا تذکرہ ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام رازی کے نزدیک یہ تمام آیات باہم دگر نہایت مربوط اور منظم ہیں۔

وَلَوْ أَنَّهُمْ آمَنُوا وَاتَّقَوْا الخ (۱۰۳) کے متعلق رقمطراز ہیں:
"پہلے آیت (۱۰۲) میں یہود کے بارے میں یہ وعید بیان ہوئی ہے کہ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهِ، اس کے بعد ترہیب و ترغیب کے درمیان جمع کرنے کے لیے یہ وعدہ بیان کیا جا رہا ہے کیونکہ یہ جامعیت طاعت کی دعوت اور معصیت سے انحراف کے لیے زیادہ موزوں ہوتی ہے۔

اور یہ جو کہا گیا ہے کہ وَلَوْ أَنَّهُمْ آمَنُوا تو یہ اس لیے کہ اوپر کہا گیا تھا کہ ان کے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب کو اپنی پیٹھ کے پیچھے پھینک دیا تھا (۱۰۱) اور وہ ان چیزوں کے درپے ہو گئے تھے جو شیاطین عہد سلیمان میں پڑھتے پڑھاتے تھے اور انہوں نے سحر کو اختیار کر لیا تھا (۱۰۲) اس لیے یہاں یہ کہا جا رہا ہے کہ اگر وہ اس کتاب پر

ایمان لاتے جس کو انہوں نے پیٹھ پیچھے پھینک دیا تھا۔" (ج ۱ ص ۴۵۶)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا الخ (۱۰۴) کے سلسلے میں بتاتے ہیں کہ:
"پہلے بعثت نبوی سے قبل کے یہودیوں کے اعمال قبیحہ کی شرح و تفصیل کی گئی تھی اس لیے مناسب ہوا کہ اب یہاں بعثت کے وقت کے یہودیوں کے قبیح اعمال کی شرح و تفصیل بھی کی جائے اور ان کی اس سعی و سازش کا پردہ فاش کیا جائے جو وہ آپ اور آپ کے دین میں قدح و طعن کی غرض سے کر رہے تھے۔ یہ اس باب کی نوع اول ہے۔" (ج ۱ ص ۴۵۷)

مَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا الخ (۱۰۵) کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:
"پہلے یہود و کفار کی عداوت و عناد کا حال بیان کیا۔ اب مومنین کو ان سے چوکنا کیا جا رہا ہے اور ان سے کفار کی محبت و مودت کی نفی کی جا رہی ہے۔" (ج ۱ ص ۴۵۷)

مَا نَنسَخْ مِنْ آيَةٍ الخ (۱۰۶) کے متعلق لکھتے ہیں کہ:
"یہ اسلام کے بارے میں یہود کے طعن و تشنیع کی دوسری نوع بیان کی گئی ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ذرا محمد کو دیکھو کہ اپنے ساتھیوں کو ایک بات کا حکم دیتے ہیں پھر اس سے رد کرتے ہیں اور اس کے برخلاف حکم دیتے ہیں۔ اس طرح آج ایک بات کہتے ہیں اور کل اس سے رجوع کر لیتے ہیں۔" (ج ۱ ص ۴۵۸)

أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ الخ (۱۰۷) کے متعلق فرماتے ہیں کہ:
"اللہ نے جب نسخ کے جواز کا حکم بیان کیا تو اس کے بعد ہی یہ بھی واضح کر دیا کہ آسمان و زمین کی بادشاہی اسی کے لیے ہے نہ کہ کسی اور کے لیے۔ یہ اس بات پر تنبیہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے امر و نہی دونوں حسن اور عمدہ ہوتے ہیں کیونکہ وہی مخلوقات

کا مالک ہے اور یہی ہمارے اصحاب کا مذہب ہے۔" (ج ۱ ص ۴۶۳)

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ (۱۰۹) کے تحت لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے ساتھ یہ یہود کی تیسری نوع کی کید اور چال بیان کی گئی ہے۔ اس کی تفصیل و وضاحت کے لیے ایک روایت بھی نقل کی ہے جس کا لب لباب یہ ہے کہ غزوۂ احد کے بعد یہود کے ایک گروہ نے حذیفہ بن یمان اور عمار بن یاسر کو کفر کی روش اختیار کرنے کے لیے ورغلایا تھا (ج ۱ ص ۴۶۵)

وَقَالُوا لَن يَدْخُلَ الْجَنَّةَ الخ (۱۱۱) کو یہود کی تخلیط اور مسلمانوں کے دلوں میں شبہ پیدا کرنے کی چوتھی نوع بتایا ہے۔ (ج ۱ ص ۴۷۱)

وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصَارَىٰ الخ (۱۱۳) کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس سے پہلے یہود و نصاریٰ کے بارے میں جو ذکر آیا تھا وہ ایک ساتھ تھا یعنی وَقَالُوا لَن يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَن كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ (۱۱۱) اس لیے اس آیت میں انکا علیحدہ علیحدہ ذکر کیا ہے اور ان میں سے ہر فریق کا دوسرے فریق کے بارے میں قول نقل کرکے دکھایا ہے کہ کس طرح ایک گروہ دوسرے گروہ کے دین کا انکار کر رہا ہے (ج ۱ ص ۴۷۴)

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا (۱۱۶) کو وہ یہود، نصاریٰ اور مشرکین کے قبیح افعال کی دسویں نوع بتاتے ہیں (ج ۱ ص ۴۸۴) اور وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ (۱۱۸) کو ان جماعتوں کے قبائح کی گیارھویں نوع قرار دیتے ہیں (ج ۱ ص ۴۸۸)

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا (۱۱۹) کا نظم اس طرح بتایا ہے:

"جب لوگوں نے ضد، عناد اور باطل پر اصرار کیا اور سرکشی سے معجزات کا مطالبہ

کیا تو اللہ نے اپنے رسول کے لیے یہ حقیقت واضح کی کہ اب ان کے لیے مزید دلائل مہیا کرنے کی ضرورت نہیں، اس لیے آپ ان کے کفر پر غمگین نہ ہوں اور اپنی تبلیغ و دعوت کا کام انجام دیتے رہیں، اس سے سوا کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" (ج ۱ ص ۴۸۹)

وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ الخ (۱۲۴) کا نظم کلام اس طرح بیان کیا ہے:

"بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ نے پہلے اپنے انعامات کا استقصا کیا تھا پھر ان کی دینی و عملی خرابیاں شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمائی اور سلسلۂ بیان کا خاتمہ اسی طرح کی آیت پر کیا ہے جس سے اس سلسلہ کا آغاز کیا تھا یعنی يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي الخ (۱۲۳) اب یہاں سے ایک دوسری نوعیت کا سلسلۂ بیان شروع ہوتا ہے یعنی حضرت ابراہیمؑ کی سرگزشت اور ان کے حالات کی کیفیت، اس کی حکمت یہ ہے کہ وہ ایک ایسے شخص تھے جن کی فضیلت کے تمام گروہ اور ملتیں معترف تھیں، مشرکین بھی ان کے معترف تھے اور ان کی اولاد میں ہونے، ان کے حرم میں سکونت پذیر اور ان کے گھر کے خادم ہونے کو اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے اور اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ بھی ان کے فضل کے معترف تھے اور اس پر ناز کرتے تھے کہ وہ انہی کی نسل سے ہیں، اس بنا پر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ایسے امور بیان کیے ہیں جو مشرکین، یہود اور نصاریٰ سب کے لیے اس کو لازمی قرار دیتے ہیں کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کو مانیں، آپ کے دین کا اعتراف کریں اور آپ کی شریعت کو قبول کریں۔" (ج ۱ ص ۴۹۰، ۴۹۱)

اس حقیقت کو آگے امام صاحب نے پانچ طریقوں سے واضح کیا ہے۔

وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً الخ (۱۲۵) کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"اس میں حضرت ابراہیمؑ کی حالت کی اس وقت کی کیفیت بیان کی گئی ہے جب انہیں امامت کا مکلف بنایا گیا تھا اور یہ ان کی دوسری تکلیف کی شرح ہے جو بیت اللہ کی تطہیر سے تعلق رکھتی ہے۔" (ج ۱ ص ۴۹۹)

وَاِذْ قَالَ اِبْرَاهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا الخ (۱۲۶) کے متعلق بتاتے ہیں کہ اس میں حضرت ابراہیمؑ کے حالات کی تیسری نوعیت بیان ہوئی ہے (ج ۱ ص ۵۰۴) اور وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرَاهِيْمُ الْقَوَاعِدَ (۱۲۷) میں حالات ابراہیمی کی چوتھی نوعیت بتائی ہے۔ (ج ۱ ص ۵۰۶)

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرَاهِيْمَ الخ (۱۳۰) کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ:

"حضرت ابراہیمؑ کے جو حالات اوپر بیان کیے گئے اور جن پاکیزہ شرائع کے بارے میں ان کی آزمائش ہوئی اور بیت اللہ کی بنا، بندگان خدا کو اس کے حج کی دعوت اور ان کی فطرت میں بندوں کے مصالح کی جو رعایت و حرص اور ان کے لیے دعائے خیر کا جو جذبہ ودیعت کیا تھا، ان کے علاوہ جو باتیں اس سے پہلے بیان ہوئی ہیں۔ ان پر لوگوں کو تعجب ہوا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ملت ابراہیمی اور اس کے شرائع پر ایمان لانے سے بجز بے وقوفوں کے اور کس کو نفرت و بیزاری ہو سکتی ہے۔ اس طرح اس آیت میں یہود و نصاریٰ اور مشرکین عرب کو توبیخ کی گئی ہے کیونکہ حضرت ابراہیمؑ پر یہود بھی فخر کرتے تھے اور ان سے اپنا رشتہ ناتہ جوڑتے تھے نصاریٰ کا سرمایۂ افتخار گو حضرت عیسیٰؑ تھے مگر ماں کی جانب سے ان کا نسبی تعلق بھی حضرت اسرائیل سے تھا، رہے قریش تو وہ زمانۂ جاہلیت میں ہر خیر و خوبی کو اسی گھر کی برکت خیال کرتے تھے جس کی تعمیر حضرت ابراہیمؑ نے کی تھی، اسی لیے انکو کتاب اللہ کی دعوت دی جا رہی ہے۔

پورے عرب یعنی آل عدنان کا مرجع حضرت اسمٰعیلؑ کی ذات گرامی تھی ان سے اسی تعلق کی وجہ سے وہ قحطانیوں پر فخر کرتے تھے کیونکہ اللہ نے حضرت اسمٰعیلؑ کو نبوت عطا کی تھی۔ اس طرح تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ سب کا سرمایہ ناز و افتخار حضرت ابراہیمؑ تھے اور جب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ انہیں نے اس نبی آخر الزماں کی بعثت کے لیے دعا و تضرع کیا تھا تو ان لوگوں پر کس قدر حیرت ہے جن کا سب سے بڑا فضل و فخر حضرت ابراہیمؑ سے تعلق ہے اسکے باوجود وہ اس رسول پر ایمان نہیں لا رہے ہیں جو دعائے ابراہیمی کا ثمرہ تھے۔" (ج ۱ ص ۵۱۴)

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ (۱۳۱) کو وہ حضرت ابراہیم کی حکایت کی پانچویں (ص ۵۱۵) اور وَصّٰى بِهَآ اِبْرَاهِيْمُ بَنِيْهِ (۱۳۲) کو چھٹی قسم قرار دیتے ہیں (ج ۱ ص ۵۱۶)

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ الخ (۱۳۳) کا ماسبق آیت سے تعلق یہ بتایا ہے کہ پہلے دین و اسلام کے متعلق اپنے بیٹوں کو حضرت ابراہیمؑ کی بلیغ وصیت کا ذکر تھا، اس کے بعد حضرت یعقوبؑ کی اسی طرح کی وصیت کا تذکرہ یہود و نصاریٰ پر حجت کی تاکید اور مبالغہ بیان کے طور پر کی گئی ہے (ج ۱ ص ۵۱۷)

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا (۱۳۵) کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ:

"جب اللہ تعالیٰ نے وہ دلائل واضح کر دیے جن سے دین اسلام کی صحت ثابت ہوتی ہے تو اس کے بعد اسلام کے بارے میں مخالفین و معاندین کے شبہات کے بعض انواع و اقسام کا ذکر بھی مناسب ہوا" (ج ۱ ص ۵۲۱)

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ الخ (۱۳۷) کا ربط یہ بتایا ہے کہ:

"جب اللہ نے دین کے اس واضح طریقہ کو بیان کر دیا کہ آدمی اس کی نبوت کا اعتراف کرے جس کی نبوت کی دلیل قائم ہو چکی ہے اور اس میں بحث و مناقضہ سے احتراز کرے تو اس کے بعد انہیں اسی طرح کے ایمان کی ترغیب دلائی ہے۔" (ج ۱ ص ۵۲۳)

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ (۱۳۶) کے بارے میں امام صاحب کی تقریر ملاحظہ ہو:

"جب پہلے اللہ تعالیٰ نے جدلی جواب دیا تھا تو اس کے بعد اس آیت میں اس نے برہانی جواب کا ذکر کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ انبیا علیہم السلام کی نبوت کی معرفت کا طریقہ ان کے معجزات کا ظہور ہے اور جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ معجزہ ظاہر ہو گیا تو ان کی نبوت کا اعتراف اور ان کی رسالت پر ایمان لانا ضروری ہو گیا کیونکہ بعض کو قبول سے اور بعض کو رد سے مخصوص کر دینا دلیل میں مناقضہ اور تناقض کو موجب کر دیتا ہے اور یہ عقلاً ممتنع ہے اور یہی اللہ تعالیٰ کے قول قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ کی مراد اور اس آیت کو لانے کا اصلی مقصد ہے۔ پس اگر یہ کہا جائے کہ ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام پر ایمان لانا کیسے جائز ہوگا جبکہ یہ کہا جاتا ہے کہ ان کے شرائع منسوخ ہو گئے ہیں تو ہم یہ کہیں گے کہ ہمارا اس پر ایمان ہے کہ ان میں سے تمام شرائع اپنے زمانے میں برحق تھے اس لیے ہماری جانب سے کوئی تناقض لازم نہیں آتا ہے یہود و نصاریٰ تو چونکہ یہ بعض ایسے لوگوں کی نبوت کا اعتراف کر چکے ہیں جن سے معجزات کا ظہور ہو چکا ہے اور نبوت محمدی کا انکار کر رہے ہیں جب کہ آپ سے بھی معجزات کا صدور ہوا ہے تو ایسی صورت میں ان پر تناقض لازم آتا ہے اس تقریر سے دونوں کا فرق

ظاہر ہو گیا۔ (ج ۱ ص ۵۲۲)

صِبْغَةَ اللّٰهِ (۱۳۸) کے متعلق لکھتے ہیں:

"پہلے یہ جواب گزرا اور اس چیز کا ذکر ہو چکا ہے جو اس دین کی صحت پر دلالت کرتی ہے تو اس کے بعد اب ایسی چیز کا ذکر ہو رہا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس دین کے دلائل واضح اور روشن ہیں (ج ۱ ص ۵۲۴)

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ (۱۴۱) کا نظم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جب ان انبیاء کے بارے میں اللہ کا محاجہ ہو چکا تو اس کے بعد یہ آیت حسب ذیل وجوہ سے لائی گئی ہے۔

(۱) تاکہ یہ وعظ و پند اور زجر و توبیخ کا کام دے اور اس طرح وہ آباء و اجداد کے فضل و شرف پر تکیہ نہ کر لیں کیونکہ ہر شخص کا مواخذہ اس کے عمل کی وجہ سے ہوگا۔

(۲) مصلحتوں کے اختلاف کی وجہ سے جب یہ بات لائق استنکار نہیں ہے کہ تمہارے فرائض بھی بعینہٖ وہی ہوں جو ان کے تھے تو اس پر کیوں ناگواری ہے کہ مصلحتوں کے اختلاف کی وجہ سے محمدؐ تم کو ایک ملت سے دوسری ملت کی طرف منتقل کر رہے ہیں۔

(۳) جتنا انبیاء کا ذکر ان آیات میں تھا جب ان کے طریقہ کے حسن و خوبی کا ذکر ہو چکا تو یہاں یہ واضح کیا ہے کہ دلیل اس طرح مکمل نہیں ہوئی ہے بلکہ ہر انسان سے اس کے عمل کے بارے میں باز پرس ہوگی اور حق کو چھوڑ دینے کا کوئی عذر صحیح نہیں ہوگا۔" (ص ۵۲۷)

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ الخ (۱۴۲) پر یہ نوٹ ملاحظہ ہو:

"اسلام پر طعن کرنے کیلئے یہود و نصاریٰ جو شبہات وارد کر رہے تھے ان میں سے یہ دوسرا شبہ ہے چنانچہ وہ کہتے تھے کہ نسخ یا تو جہل کا اقتضا ہوگا یا تجہیل کا اور یہ دونوں حکیم و دانا کے شایان شان نہیں کیونکہ حکم یا تو قید سے خالی ہوگا یا مقید لا دوام ہوگا یا مقید بالدوام۔

پس اگر وہ قید سے خالی ہوا تو فعل ایک ہی بار کا متقاضی ہوگا جس کے بعد اسکے خلاف کوئی حکم ناسخ نہیں ہو سکتا اور اگر قید لا دوام سے مقید ہے تو یہاں یہ ظاہر ہے کہ اس کے بعد اس کے خلاف آنے والا حکم اس کا ناسخ نہیں ہو سکتا اور اگر قید دوام سے مقید ہے تو اگر امر کے بارے میں یہ اعتقاد رکھا جائے کہ وہ دائماً باقی رہے گا۔ اسی کے ساتھ وہ کوئی ایسا لفظ لائے جو اس کے ہمیشہ باقی رہنے پر دلالت کرے پھر وہ اسے منسوخ کردے تو یہ ایسا جاہل ہوگا جس کے لیے یہ بات بعد میں ظاہر ہوئی اور اگر وہ یہ جانتا تھا کہ یہ حکم ہمیشہ باقی نہیں رہے گا جبکہ اس نے ایسا لفظ ذکر کیا تھا جو اس کے ہمیشہ باقی رہنے پر دلالت کرتا تھا تو یہ تجہیل ہوگی، اس سے ثابت ہوا کہ نسخ یا تو جہل کا مقتضی ہوگا یا تجہیل کا اور یہ دونوں باتیں اللہ تعالیٰ کے بارے میں محال ہیں؛ اس لیے اس کی جانب سے نسخ بھی محال ہوا، اس لیے اللہ تعالیٰ کے احکام میں آنے والے نسخ کا باطل ہونا واجب ہے؛ غرض اس طرح قبلہ کے نسخ میں قدح کی وجہ سے وہ اسلام میں طعن تک پہنچ گئے پھر انہوں نے یہ کہکر شبہ کو مزید تقویت دی ہے کہ ہم نسخ کو مصلحتوں کے اختلاف کے وقت ہی جائز قرار دے سکتے ہیں اور یہاں تو تمام جہات اس طور پر برابر ہیں کہ وہ اللہ ہی کے لیے ہیں اور اس کی مخلوق ہیں پس ایک سمت سے دوسری سمت میں

قبلہ کی تغییر ایک ایسا فعل ہے جو مصلحت سے خالی ہے اس لیے وہ ایک عبث کام ہوا جو خدائے حکیم کے شایان شان نہیں ہے یہ بات اس امر کی دلیل ہے کہ تغییر اللہ تعالیٰ کی جانب سے نہیں ہے اس طرح وہ اسلام میں طعن کے درپے ہوئے۔"

(ج ۱ ص ۵۲۷)

آگے امام صاحب نے ان شبہات کے جواب بھی دیے ہیں لیکن ہم ان سے اس لیے قطع نظر کرتے ہیں کہ ہمارا مقصود یہ دکھانا ہے کہ امام صاحب کے نزدیک یہ کلام منظم و مربوط اور اس سلسلۂ بیان سے جڑا ہوا ہے جو اسلام پر یہود کے قدح و طعن کے تعلق سے پہلے بیان ہوا تھا۔

وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ (۱۴۵) کا تعلق اس کے ماقبل کی آیت سے اس طرح بیان کیا ہے کہ:

"اس سے پہلے والی آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ واضح کیا تھا کہ اہل کتاب اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ یہی قبلہ برحق ہے اس کے بعد یہاں یہ واضح کیا جارہا ہے کہ ضد و عناد پر استمرار و دوام کی انکی اس خصوصیت میں تغیر نہیں ہو سکتا۔"

(ج ۱ ص ۵۴۹)

كَمَا اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا الخ (۱۵۱) کا نظم پورے سلسلۂ بیان سے اس طرح واضح کیا ہے:

"ہم بتا چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دین محمدیؐ کی صحت ثابت کرنے کے لیے مختلف پہلوؤں سے جو استدلال کیے ہیں ان کی مختلف نوعیتیں ہیں، بعض الزامی نوعیت کے ہیں جیسے یہ کہ یہ دین حضرت ابراہیمؑ کا دین ہے اس لیے اسے قبول کرنا

لازمی ہے اور وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهِيْمَ الخ (۱۳۰) سے یہی مراد ہے۔
بعض استدلال برہانی ہیں جیسے قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ
اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ الخ (۱۳۶) اس استدلال
کے بعد یہود کے دو شبہات بیان کیے ہیں ایک کا ذکر كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى
تَهْتَدُوْا (۱۳۵) کہہ کر کیا ہے اور ان کا دوسرا استدلال انکار نسخ کے ذریعہ
اس شریعت پر قدح ہے جس کا ذکر سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ الخ (۱۴۲)
میں ہے اور اس شبہ کا نہایت مفصل جواب دیا کیونکہ نبوت محمدی کے انکار میں یہود
کا سب سے بڑا شبہ انکار نسخ ہے اس لیے اس کا بہت مفصل جواب دیا جس کا خاتمہ
وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ (۱۵۰) پر کیا ہے اس طرح یہ کلام جس میں شبہ کا جواب دیا
گیا ہے اللہ کی عظیم نعمتوں پر ایک تنبیہ ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ اسلوب
قلوب کو مائل کرنے کے لیے زیادہ کارگر ہے" (ج ا ص ۵۵۹)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (۱۵۳) کے سلسلہ میں نظم
کلام کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس سے پہلے کی آیت میں فَاذْكُرُوْنِيْٓ کہہ کر تمام عبادات کو اور وَاشْكُرُوْا لِيْ
کہہ کر شکر کے متصلات کو واجب قرار دیا تھا اس کے بعد اس چیز کو اس آیت میں
بیان کیا ہے جو ذکر و شکر کے لیے معاون ہیں یعنی صبر و صلوٰۃ اور ان دونوں کا ذکر مخصوص
طور پر اس لیے کیا ہے کہ یہ دونوں عبادات کے لیے معین ہیں" (ص ۵۶۱)

آگے امام صاحب نے ان دونوں کی حقیقت بیان کر کے ان کے استعانت کے پہلو
دکھائے ہیں۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ الخ (۱۵۴) کے متعلق لکھتے ہیں:

"ماقبل آیت سے اس کا تعلق اس طرح ہے گویا یہ کہا جا رہا ہے کہ میرے دین کو قائم
کرنے میں صبر و صلوٰۃ سے مدد چاہو پس اگر اقامت دین میں اموال و ابدان کے ذریعہ
میرے دشمنوں سے جہاد کی ضرورت پیش آئے اور تم اسے کرو اور تمہارے نفوس تلف
ہو جائیں تو یہ خیال نہ کرو کہ تم نے انہیں ضائع کر دیا بلکہ اس حقیقت کو جان لو کہ تمہارے
مقتولین میرے یہاں زندہ ہیں" (ج ا ص ۵۶۲)

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ الخ (۱۵۵) کے متعلق فرماتے ہیں:

"قفال نے اس کو اِسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ سے متعلق بتایا ہے مفہوم یہ
ہوگا کہ صبر و نماز سے مدد چاہو کیونکہ ہم تمہیں خوف وغیرہ سے آزمائیں گے اگر یہ کہا جائے
کہ اللہ تعالیٰ نے تو وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ فرمایا ہے اور شکر مزید کا موجب ہے
جیسا کہ فرمایا وَلَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ تو اس کے بعد وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ
مِّنَ الْخَوْفِ کس طرح لائے ہیں؟ اس کا جواب دو طرح سے ہو سکتا ہے اول یہ کہ اللہ
نے بتایا ہے کہ شرائع کی تکمیل ہی اتمام نعمت ہے اور یہی شکر کی موجب ہے، پھر یہ
بتایا کہ ان شرائع پر قائم رہنا محن و شدائد کے تحمل کے بغیر ممکن نہیں ہے اس لیے صبر
کا حکم دینا ضروری ہوا ثانیاً یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اولاً انعام کیا پھر شکر کا حکم دیا پھر ابتلا کا
ذکر کیا اور صبر کی تعلیم دی تاکہ آدمی شاکرین و صابرین کا درجہ ساتھ ہی حاصل کرے
اور اس کا ایمان مکمل ہو جائے جیسا کہ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ ایمان دو نصف سے
عبارت ہے ایک نصف صبر ہے اور دوسرا شکر" (ج ا ص ۵۶۴)

اَلَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ الخ (۱۵۶) کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

"جب پہلے وَبَشِّرِ الصَّابِرِیْنَ (۱۵۵) کہا تو اس آیت میں یہ بیان کیا کہ انسان کس طرح صابر ہو سکتا ہے اور یہ بشارت کیسی ہے"۔ (۵۶۶)

آیت (۱۵۸) اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَۃَ الخ کے سلسلہ میں رقمطراز ہیں:

"اس آیت کا ماقبل سے تعلق کئی وجہوں سے ہے ایک یہ ہے کہ اللہ نے قبلہ بدل کر کعبہ کی طرف اس لیے کر دیا کہ حضرت ابراہیمؑ کے دین و شرائع کے احیاء سے اپنا انعام محمدؐ اور ان کی امت پر مکمل کر دے، اور سعی بین الصفا والمروہ بھی ابراہیم کے شعائر اور یادگاروں میں ہے جیسا کہ بنائے کعبہ کے واقعہ میں بیان کیا گیا اور حضرت ہاجرہؑ نے انہی پہاڑوں کے درمیان سعی کی تھی اور جب معاملہ اس طور پر ہے تو اللہ نے اس حکم کو اس آیت کے بعد رکھا۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ جب اللہ نے یہ فرمایا کہ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ الخ اور پھر یہ کہا کہ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَۃَ الخ اور ان دونوں کو شعائر اس لیے بنایا کہ یہ دونوں حضرت ہاجرہؑ اور حضرت اسماعیلؑ کے آثار اور یادگاروں میں ہیں اور ان دونوں کو یہاں آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑا۔

تیسری نوعیت یہ ہے کہ اللہ کی تکلیفات کی تین قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس کے حسن کا فیصلہ عقل ابتدا ہی میں کر دے، اس قسم کو پہلے یہ کہہ کر بیان کیا کہ فَاذْكُرُوْنِیْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِیْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ کیونکہ ہر عقلمند جانتا ہے کہ منعم کا ذکر مدح و ثنا کے ساتھ کرنا، شکر پر مواظبت اختیار کرنا عقل کے نزدیک ایک بہت مستحسن امر ہے، دوسری قسم وہ ہے جس کے قبح کا فیصلہ عقل اولاً کر دے مگر اس وجہ سے کہ وہ شریعت کا حکم ہے اس کا حسن ہونا تسلیم کرنا پڑتا ہے مثلاً

آلام مصائب، فقر اور محن کا انزال یہ سب عقل کے نزدیک قبیح ہے کیونکہ ان میں اللہ کا کوئی نفع نہیں ہے بلکہ بندے کو ان سے اذیت ہوتی ہے تو یہ چیز قبیح و معیوب کی طرح ہے مگر چونکہ شریعت میں یہ وارد ہے اور اس کی حکمت ابتلا و امتحان بتائی گئی ہے جیسا کہ فرمایا وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ الخ اس بنا پر مسلمان اس کے بہتر اور عمدہ اور حکمت و صواب پر مبنی ہونے کا عقیدہ رکھتا ہے تیسری قسم ان چیزوں کی ہے جن کے حسن و قبح کا فیصلہ نہیں ہو پاتا بلکہ اسے عبث اور نفع و نقصان سے خالی سمجھا جاتا ہے جیسے افعالِ حج میں سعی بین الصفا والمروہ تو اللہ تعالیٰ نے اس قسم کو پہلے دونوں اقسام کے بعد بیان کیا تاکہ یہ تمام اقسام تکلیفی پر متنبہ کر دے"۔ (ج ۱ ص ۵۶۹)

اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا الخ (۱۶۰) کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"اس سے پہلے مرتکبینِ کتمان کے حق میں شدید وعید بیان کی گئی تھی اس سے ممکن ہے لوگوں کو یہ خیال ہو کہ انہیں وعید ہر حال میں لاحق ہوگی اس لیے یہ بتایا گیا کہ جب توبہ و اصلاح کر لیں گے تو ان کا حکم بدل جائے گا اور وہ اہل وعد میں شامل ہو جائیں گے"۔ (ج ۱ ص ۵۷۴)

(باقی)

مصطفیٰ صادق الرافعی

از جناب ابوسفیان اصلاحی، علی گڑھ

(۲)

معاشرتی مقالات

مصطفیٰ صادق الرافعی نے معاشرتی موضوعات پر متعدد مقالات تحریر کیے ہیں جن میں ان امور پر بحث و گفتگو کی ہے جن سے معاشرہ میں صلاح یا فساد رونما ہوتا ہے، وہ صالح روایات کو معاشرہ میں فروغ دینے کے حامی ہیں اور فاسد عناصر سے اسے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں اپنے مقالہ "المعنی السیاسی فی العید" میں انھوں نے بتایا ہے کہ قوموں کی زندگی میں تیوہار کی خاص اہمیت ہے، مسلمانوں کا سب سے بڑا تیوہار عید ہے جو اخوت و محبت، ہمدردی و باہمی تعاون کا ایک عظیم مظہر ہے، لیکن یہ ظاہری و فکری دونوں قسم کی تبدیلیوں کی متقاضی ہے، عید جس طرح مسلمانوں کے لیے مسرت و شادمانی لے کر آتی ہے، اسی طرح ان میں وحدت، اجتماعیت اور یک رنگی بھی پیدا کرتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا ہر ہر فرد ایک ہی وطن اور خاندان سے وابستہ ہے، اس سے اسلامی شان و شوکت کا پتہ چلتا ہے اور ملی جذبہ و احساس بیدار ہوتا ہے، چھوٹے بڑے امیر و غریب سب اس دن گلے ملتے ہیں اس سے اسلامی مساوات کا تصور سامنے آتا ہے، اس کا خیال ضرور رہنا چاہیے کہ اس دن کوئی فرد عید کی خوشی سے محروم نہ رہے، کیونکہ سارے مسلمان ایک جسم کے مانند ہیں[1]

---

[1] وحی القلم ۱/ ۳۶، ۳۷۔

ایک مقالہ میں رافعی نے بتایا ہے کہ اسلام کے ماننے والوں کو مسلم کہا جاتا ہے جو شریعت اسلامی کے تمام احکام و فرائض کی پیروی کرتا ہے اور اپنی نفسانی خواہشات اور ذاتی اغراض و مقاصد کو معاشرہ کے اغراض و مقاصد پر قربان کر دیتا ہے کیونکہ اسلام کا مفہوم ہی اطاعت، پیروی اور خود سپردگی ہے، بندۂ مومن سے اس کا مطالبہ یہ ہے کہ وہ اپنی پوری زندگی اسلامی اصولوں کے مطابق گزارے اور اوہام و خرافات سے اجتناب کرے، اللہ کے سامنے دن میں پانچ بار سجدہ ریز ہو، کیونکہ نماز ہی پر دین کی عمارت قائم ہے، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے "عماد الدین" کہا ہے، قرون اولیٰ کے مسلمان قرآن و حدیث کو اپنا دستور حیات سمجھتے تھے اور ان کی ہدایات و تعلیمات پر عمل کرنے کو اپنے لیے باعث نجات و سعادت خیال کرتے تھے[1]

بندۂ مومن دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کے بعد آلام و مصائب سے بے فکر ہو جاتا ہے وہ موت سے لرزہ براندام نہیں ہوتا بلکہ فرشتوں کی ملاقات و معانقہ کی حلاوت و لذت کے تصور میں گم ہو جاتا ہے۔ خدا کی راہ میں پیش آنے والی آزمائشوں میں گھبراتا نہیں۔

رافعی نے ایک مضمون میں روزے کی حکمت و مصلحت یہ بتائی ہے کہ ایک متعینہ عرصہ تک ماکولات، مشروبات اور لذائذ سے رک جانے کا مقصد نفس کی تہذیب و تربیت ہے، روزہ آدمی کی قوت ارادی کو مضبوط کرتا ہے، اس کے قلب کو تقویت بخشتا ہے اور اسے اپنی نفسانی خواہشات پر قابو پانے کا عادی بناتا ہے، اسے استقلال اور ثابت قدمی عطا کرتا ہے جس کی وجہ سے آدمی دین کے ہر موقف پر اٹل رہتا ہے اور

---

[1] وحی القلم ۲/ ۱۲، ۱۴۔

مشکلات و شدائد میں اس کے اندر لغزش نہیں پیدا ہوتی۔

روزہ سے معاشرہ کی اصلاح و تطہیر بھی ہوتی ہے، یہ رذائل و خبائث سے اسے پاک کر دیتا ہے، اس کی وجہ سے ہمدردی و مواسات کا جذبہ پرورش پاتا ہے، اور یہ ضرورتمند اور پریشان حال لوگوں کی مدد پر ابھارتا ہے [1]

مصطفیٰ صادق الرافعی کے بعض معاشرتی مقالات میں عربوں پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عرب مسلمانوں میں فکری، سیاسی اور مذہبی بیداری پیدا کرنا چاہتے تھے، یہودیوں اور انگریزوں نے ان کی تہذیب و ثقافت پر جو مظالم ڈھائے تھے اس پر انہیں سخت افسوس تھا۔

فلسطین کے مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ جس معاہدہ کی رو سے یہ بات طے پائی تھی کہ مسلمان اور یہودی مل کر سکون سے رہیں گے بعد میں اندازہ ہوا کہ وہ عیاری اور فریب پر مبنی تھا اور اس کا مقصد آزاد قوم کو قتل کرنے کی سازش تھی، یہودی اس وقت ان کا گلا گھونٹنے پر آمادہ ہیں، اس لیے ان کی مدد کی شدید ضرورت ہے تاکہ وہ یہودیوں کا مقابلہ کر سکیں وہ سیاسی اعتبار سے ذلت و نکبت کی زندگی بسر کر رہے ہیں، ان کی اس صورت حال پر دنیا کے مسلمانوں کو قانع نہیں رہنا چاہیے بلکہ انکی ہر قسم کی مالی امداد کرنا چاہیے۔

یہودی کہتے ہیں کہ وہ پوری دنیا میں ذلیل و خوار ہیں اس لیے فلسطین میں انہیں آزادانہ زندگی بسر کرنے کا حق ملنا چاہیے کیا فلسطین دنیا سے الگ تھلگ ہے؟ انگریز ان کی مکمل پشت پناہی کر رہے ہیں، ان سب کی متحدہ کوشش ہے کہ وہ فلسطینیوں کے

---

[1] وحی القلم - ۲/ ۷۳، ۷۴، و ۷۵۔

ضمیر اور ان کے وجود کو ختم کر دیں کیا یہودی بتائیں گے کہ آخر دنیا کی دوسری قوموں نے انہیں کیوں اپنے ملکوں سے نکال باہر کیا؟ کیا یہودیوں کو اسلام کی طاقت و قوت کا علم نہیں ہے، انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ مسلمانوں کے حوصلے اب بھی بہت بلند ہیں، اللہ کے شیروں کو روباہی نہیں آتی، رافعی فلسطینیوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تم کیوں خاموش ہو؟ کیا تم نے اپنے اسلاف کی تاریخ کا مطالعہ نہیں کیا ہے، وہ دنیا کی کسی بھی طاقت سے خائف اور مرعوب نہیں ہوتے تھے، اس وقت دشمنانِ اسلام کے خلاف متحدہ محاذ قائم کرنے کی ضرورت ہے اور سارے مسلمانوں کا یہ ملی فریضہ ہے کہ وہ فلسطینیوں کی امداد کے لیے کمربستہ ہو جائیں [1]

مقالہ "اللغۃ والدین والعادات" میں عربوں کو اس امر کی جانب توجہ دلائی ہے کہ زبان، دین اسلام اور ثقافت ہی باوقار زندگی کی ضامن ہیں جن کو مٹانے کے انگریز درپے ہیں، حالانکہ انہی تینوں چیزوں سے کسی قوم کے خصوصیات و امتیازات کا اندازہ ہوتا ہے۔ زبان افکار و خیالات میں ہم آہنگی پیدا کرنے کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ اس کی وسعت اور گیرائی قوم کی وسعت و گیرائی کا پتہ دیتی ہے، یہ آزادی کے راستوں کو ہموار کرتے اور غلامی کے خاتمہ میں ممد و معاون ہوتی ہے۔

رافعی عربوں کو تلقین کرتے ہیں کہ انہیں عربی زبان و ادب کی ترقی کے لئے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے تاکہ وہ شاہراہ ترقی کو پالیں اور انہیں برگ و بار لانے کے مواقع میسر ہوں۔ قوم کی شان و شوکت میں اسی وقت اضافہ ممکن ہے جب کہ لوگوں کے اندر آگے بڑھنے کے ولولے ہوں، ان کے مزاج اور عمل میں مطابقت ہو، اپنے معاملات

---

[1] وحی القلم - ۲/ ۲۶۰ - ۲۶۱ و ۲۶۳۔

کے وہ خود مالک ہوں اور اپنے تشخص سے غافل نہ ہوں۔ علاقائی زبان سے رشتہ برقرار رہے مگر
اپنے کو حقیر تصور نہ کریں۔ اس وقت عربی زبان مختلف خطرات سے دوچار ہے، اگر اس پر قوم
کی نظر نہ ہوئی تو وہ غلامی کی ذلت سے دوچار ہوگی۔ حکومت کرنے کی صلاحیت اس کے اندر
سے مفقود ہو جائے گی۔ اپنے اسلاف کی تاریخ سے ناآشنا ہو جائے گی اور اپنے حقوق سے
دست بردار ہو کر کسی اور چیز کو اختیار کرے گی۔[1]

زبان کی زبوں حالی کا باعث خود اہل زبان ہوتے ہیں، ان کی کمزوری سے زبان پر
بھی آفت آتی ہے۔ سامراجی قوتیں سب سے پہلے کسی کو غلام بنانے کیلئے اس پر اپنی زبان
تھوپنا چاہتی ہیں۔ اس کے ذریعہ وہ اپنی سیاست و عظمت کا سکہ لوگوں کے ذہنوں میں
بیٹھا دیتی ہیں۔[2]

زبان کے بعد سب سے اہم چیز دین ہے، زبان کو دین سے قبل اس لیے رکھا گیا کہ اسی
کے ذریعہ دینی حقائق تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔ دین اسلام مسلمانوں کے اتحاد کا ضامن
ہے۔ اس نے تمام امتیازات دریا برد کر کے انہیں روحانیت اور تقویٰ کی تعلیم دی اور
اسی کو معیار فضیلت بتایا، دین اسلام ہی ملی بیداری کا موثر ترین ذریعہ ہے۔ اس میں
مادی وسائل سے زیادہ قوت اور کشش ہے، اولیاء اللہ کی حکومت دلوں اور ذہنوں پر
ہوتی ہے۔ دین سے وابستگی ہی سے مسلمانوں کی ذلت و رسوائی کا خاتمہ ہو سکتا ہے اور وہ
کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہو سکتے ہیں۔[3]

قوموں کے رسوم و عادات سے ان کی روایت و تاریخ وجود میں آتی ہے جو قومی
اتحاد میں معاون اور مفید ہوتی ہے اور ان کا تشخص برقرار رکھتی ہے۔ قومی روایات مذہب

۱؎ وحی القلم ۳/۳۷ ۲؎ ایضاً ۳؎ ایضاً ۳/۳۸ - ۳۹ - ۴۰

کی طرح موثر ہوتی ہیں اور قوموں کو ایک دائرہ میں مجتمع کر دیتی ہیں، یہ قوم کی عظمت رفتہ کی
حامل ہوتی ہیں اور اسی کی بدولت اسے اپنے بہادروں اور اصحاب علم و فن کی عظیم خدمات
اور کارناموں سے واقفیت ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے اس کے اندر حوصلہ اور تازہ
ولولہ پیدا ہوتا ہے۔[1]

اسلام اور عرب ممالک

اسلام اور عرب ممالک سے متعلق مقالات بھی معاشرتی مقالات
ہی کے ضمن میں آتے ہیں، ایک مقالہ میں رافعی نے اس مسئلہ کو اٹھایا کہ بیسویں صدی میں
جامعہ ازہر کے کیا فرائض ہیں؟ انہوں نے بتایا کہ جامعہ کے اساتذہ و طلبہ کا سب سے
اہم فریضہ یہ ہے کہ وہ دینی شعائر کے پابند ہوں، معاشرے کی اصلاح کے لیے فکر مند
رہیں، برائیوں کا سد باب کریں، لوگوں کو اسلام پر عمل کرنے کی دعوت دل نشین انداز
میں دیں۔ اسلام تمام نقائص سے پاک اور ظاہر و باطن میں یکسانیت کو پسند کرتا ہے اللہ
کے نزدیک اصل اعتبار نیتوں پر ہوتا ہے، علمائے ازہر کو، لوگوں کے سامنے اسلام کی اصلی
وحقیقی تصویر پیش کرنی چاہیے۔ حکومت مصر کی نظر سیاسی اور انتظامی امور تک محدود ہے
اور وہ دینی امور کی جانب سے بے پرواہ ہی ہے، اس کی اصلاح بھی علمائے ازہر کی
ذمہ داری ہے۔[2] ان کو مصر میں بڑی قدر و منزلت حاصل ہے، ان کے ارشادات کو لوگ
بسر و چشم مانتے ہیں، اس لیے انہیں حکومت کی خرابیوں کو دور کرنے میں نمایاں حصہ لینا
چاہیے اور اپنے طلبہ کو فقہی مسائل سے آگاہ کرنے کے علاوہ امت مسلمہ کی خدمت کی بھی
ترغیب دینی چاہیے۔

علمائے ازہر انبیاء کے وارث اور کار نبوت انجام دینے پر مامور ہیں، انہیں امت

۱؎ وحی القلم ۳/۱۴۱ ۲؎ ایضاً ۳/۴۲ - ۴۳ - ۴۴

کی قیادت کے لیے تیار ہونا چاہیے[1]، رفاہی کاموں میں پیش پیش رہنا چاہیے بیسویں صدی میں اجتہاد کی شدید ضرورت ہے، اس لیے فقہ کو از سرِ نو اس طرح ترتیب دینا چاہیے کہ اسلام کی حقیقی روح سامنے آجائے۔ عصرِ حاضر میں قرآن کریم کے اسرار و رموز بے نقاب کرنا چاہیے' اس میں جدید اور قدیم دونوں مسائل کا حل موجود ہے۔ انہیں دینی لٹریچر اور دینی تحریکوں سے استفادہ اور رہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔

ایک مقالہ میں مصری یونیورسٹی کے طلبہ اور اساتذہ کو موضوعِ گفتگو بنایا ہے۔ یونیورسٹی کے اکثر اساتذہ کا مذہب سے کوئی رشتہ نہیں ہے، طلبہ نے یونیورسٹی میں دینی نصاب کا مطالبہ کیا تو مذہب بیزار لوگوں کی جانب سے شدید ردِ عمل ہوا۔ مخلوط تعلیم کو موقوف کر کے اخلاق و روحانیت پر توجہ دینے کا مسئلہ اٹھایا گیا تو اس پر اساتذہ' پرنسپل اور منتظمین نے بڑا واویلا کیا۔

رافعی کا بیان ہے کہ مصری یونیورسٹی میں مذہبی بے راہ روی اور یورپ کی تقلید کی تو آزادی ہے لیکن طلبہ کی آزادی پر قدغن ہے، جامعہ کے کارپردازوں کے خیال میں جامعہ کے ابتدائی اور ثانوی درجات تک دینی تعلیم کا نظم ضروری ہے اسکے بعد اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ توقع ہے کہ نوجوان طلبہ یونیورسٹی کے ذمہ داروں کی اس اسکیم کو ناکام بنا دیں گے[2]۔

آگے ایک مقالہ میں عرب اقوام کے متعلق بتایا کہ اب ان کے اندر یہ شعور پیدا ہو چکا ہے کہ وہ گندی سیاست اور مغرب کی اندھی تقلید سے باز رہیں کیونکہ وہ سمجھنے لگے ہیں کہ یہ سراسر کذب' فریب' دسیسہ کاری اور مادیت ہے' اہلِ مغرب کے قول و عمل میں تضاد ہے' اس لیے عرب یورپ کی قید و بند سے آزاد ہونا چاہتے ہیں[3]۔

---

[1] وحی القلم۔ ۳/۴۲ [2] ایضاً۔ ۳/۱۸۷ [3] ایضاً۔ ۳/۱۹۸۔

عربوں کی ترقی کا اصل دار و مدار دو چیزوں پر ہے ایک اسلام پر اور دوسری چیز عربی زبان ہے' وہ اس حدیث کو بھی نقل کرتے ہیں ایک وقت آئے گا کہ امت مسلمہ کو دوسری قوموں سے ہزیمت اٹھانی پڑے گی اور وہ ان کے خلاف پل پڑیں گی اور انہیں لقمۂ تر بنا لیں گی، صحابۂ کرام نے پوچھا کہ اس وقت ہماری تعداد کیا ہوگی ؟ آپ نے بتایا کہ اس وقت تم تعداد میں بہت زیادہ ہو گے، لیکن تمہاری حیثیت سیلاب میں بہنے والے خس و خاشاک کے مانند ہوگی۔

اس وقت مغربی قوموں کے غلبہ و استیلاء سے مسلمانوں کا یہی حال ہو گیا ہے' یورپ کی اندھی تقلید نے ان کے امتیاز و تشخص کو ختم کر دیا ہے' جس کا علاج یہ ہے کہ وہ مادیت کے فریب سے نکل کر اسلام کے حصار میں داخل ہو جائیں۔ تاکہ موجودہ اخلاقی و معاشرتی بحران سے انہیں نجات ملے[1]۔

ادبی مقالات رافعی کے ادبی مقالات بھی اہمیت کے حامل ہیں' یہ اسلامی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں' ان میں غیر اسلامی افکار و خیالات کا مدلل جواب دیا ہے' اس کی وجہ سے انہیں اپنے معاصر ادیبوں کی برہمی کا سامنا کرنا پڑا۔

رافعی نے اپنے ایک مقالہ میں ادب کی یہ تعریف کی ہے کہ وہ ذہن انسانی کی ایک پیداوار ہے، جب انسان کے ذہن میں کوئی خیال پیدا ہوتا ہے تو وہ اسے لفظی جامہ پہناتا ہے' ادب ایک طرح سے خیال کی تشریح و تبیین ہے جس میں بڑی قوت و طاقت ہوتی ہے، ادیب اپنے جذبات کو نہایت حسین و جمیل انداز میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے، اسی کے ذریعہ وہ علم و فن کی دنیا میں پہچانا جاتا ہے[2]۔ وہ مختلف صلاحیتوں کا مالک

---

[1] وحی القلم۔ ۳/۲۰۳ [2] ایضاً۔ ۳/۲۴۷۔

ہوتا ہے۔ مفاہیم و معانی کی ترسیل میں اس کے یہاں ابہام نہیں ہوتا، وہ چیزوں کے محاسن اور مفاہیم کا گہرائی سے تجزیہ کرتا ہے۔ ایک عام شخص کی طرح ادیب بھی آلام و مصائب کے مرحلوں سے گزرتا ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ وہ اپنے جذبات و احساسات کو نہایت سلیقے سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کرتا ہے، کائنات کی ایک مخصوص انداز میں توضیح و تشریح کرتا ہے اور حسن و جمال میں اپنے ساتھ دوسروں کو بھی شامل کر لیتا ہے، ادیب ایک حساس انسان ہے۔ وہ افکار و خیالات کی دنیا میں مستقل اضافہ کرتا ہے اور بے رنگ چیزوں میں طرح طرح کے رنگ بھرتا ہے اور مفاہیم و مطالب کے مختلف پہلوؤں کو منظر عام پر لاتا ہے۔[1]

رافعی نے اس سے بھی بحث کی ہے کہ ایک عالم اور ادیب میں کیا فرق ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ عالم افکار و خیالات کا مجموعہ ہوتا ہے اور ادیب افکار و خیالات کے ساتھ ساتھ مخصوص انداز بیان کا بھی حامل ہوتا ہے۔ علماء کے افکار و خیالات میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا، لیکن ہر ادیب کی اپنی انفرادیت ہوتی ہے وہ اپنی تحریروں سے پہچانا جاتا ہے اور وہ خود کائنات کی حقیقتوں کا پتہ چلاتا ہے اور اپنی فکر سے زندگی کا تجزیہ کرتا ہے۔[2] رافعی کے خیال میں ادیب اپنے وقت کا سب سے بڑا انسان ہوتا ہے۔ وہ اپنی اعلیٰ ظرفی وسیع النظری اور دوررسی کی وجہ سے لوگوں میں ممتاز ہوتا ہے، حسب و نسب کے گھروندوں اور زمانے کی سرحدوں سے بلند ہوتا ہے، انسانی زندگی اس کا معیار و محور ہے۔[3]

رافعی نے شاعر اور شاعری کے متعلق بھی اپنے خیالات پیش کیے ہیں، شعر کو وہ عرفان ذات اور رشد و ہدایت کا نام دیتے ہیں، اس سے اشیا کی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔

[1] وحی القلم۔ وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو ۳/۲۵۰۔ [2] ایضاً ۳/۲۵۱۔ [3] ایضاً ۳/۲۵۳۔

اب یہ شاعر کی صلاحیت پر منحصر ہے کہ وہ کس حد تک چیزوں کی تہہ میں اتر کر ان کا پتہ چلاتا ہے، ایک عام شخص اور شاعر میں وہ یہ فرق بتلاتے ہیں کہ جو چیز عام آدمی کے ہاتھوں میں بے جان دکھائی دیتی ہے، وہی چیز جب شاعر کے ہاتھ لگتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس میں جان آ گئی ہے۔[1]

لیکن شاعر اور عام آدمیوں کے ذہن، قوت احساس اور ادراک میں واضح فرق ہوتا ہے، حالانکہ دونوں ایک ہی معاشرہ اور ایک ہی دنیا میں ہوتے ہیں، گلاب کے پھول کو دونوں دیکھتے ہیں لیکن دونوں کے دیکھنے میں بہت فرق ہے، عام انسان اسے صرف دیکھتا اور سونگھتا ہے۔ لیکن شاعر اس میں حسن کے مختلف پہلو تلاش کر لیتا ہے اور اس حسن میں دوسروں کو بھی شامل کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ انسان کو تنگنائیوں سے نکال کر وسیع فکری میدان میں لا کھڑا کرتا ہے تاکہ وہ قدرت کی صناعی اور اس کے عجائب سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکے، شاعر اسرار و حقائق تک لوگوں کو پہنچاتا ہے اور معاشرہ کی رہنمائی کرتا ہے۔[2]

خود شاعری کے حسن و قبح کو پرکھنے کے لیے رافعی تنقید کو ضروری بتلاتے ہیں، نقاد شعرا کی خامیوں اور خوبیوں کو سامنے لاتا ہے، بلند پایہ اور فروتر شاعری کی پرکھ کر لیتا ہے اس کی وجہ سے ایک عام قاری کو بھی شاعری کے حسن و قبح کا پتہ چل جاتا ہے۔[3]

رافعی نے ایک مقالہ میں جدید شاعری کے معمار اسمٰعیل پاشا صبری کی شاعری کی قدر و قیمت پر بحث کر کے دکھایا ہے کہ وہ دوسرے شاعروں کے مقابلے میں حقیقت سے زیادہ قریب ہیں، ان کے خیالات میں جذبات کی آمیزش بھی ہوتی ہے اور ان کا

[1] وحی القلم ۳/۲۷۴۔ [2] ایضاً ۳/۲۷۴ و ۲۷۵ [3] ایضاً ۳/۲۸۰۔

انداز بیان دل نشین ہوتا ہے، وہ دل شکستہ ہونے کے باوجود ہر وقت مسکراتے تھے اس لیے ان کے رنج و غم کا پتہ لگانا مشکل ہوتا تھا انہیں خلوت پسند تھی۔

غزلیہ، مدحیہ اور فکری شاعری میں صبری کا درجہ بلند ہے، کیونکہ ان میں ان کے قلبی جذبات شامل ہیں اور یہی چیز اعلیٰ شاعری کی ضامن ہوتی ہے۔[1]

وہ بارودی، صبری، ابراہیم مویلحی اور عبدہ کو عام مصری شعراء سے برتر قرار دیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ بارودی کا شعری ذوق عمدہ ہے، صبری کے یہاں جذبات کی حقیقی عکاسی ہے۔ مویلحی کے یہاں وسیع الظرفی اور عبدہ کے یہاں فکر و بصیرت ہے، صبری کے اچھے اور بلند ذوق کو وہ کتب بینی کے بجائے ان کی حسن بینی کا نتیجہ بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسی بنا پر بحتری کو دوسرے شعراء پر فوقیت حاصل تھی اور اس میں شک نہیں کہ صبری مصر کا بحتری تھا۔[2]

رافعی نے حافظ ابراہیم کو بھی زبان و بیان اور اسلوب کے اعتبار سے ایک اچھا شاعر بتایا ہے اور ان کی تاثیر کا اعتراف بھی کیا ہے مگر ان کی شاعری میں تاریخی واقعات کا ذکر ہوتا ہے اور وہ معاشرہ کا شاعر کہلاتے ہیں، لیکن رافعی کے نزدیک اس سے شاعری کے اصل تقاضے پورے نہیں ہوتے کیونکہ شاعری کو تو انسانی ذہن کے خیالات کی ترجمان ہونا چاہیے۔ فنی شاعری ہی مسائل حیات کو محیط ہوتی ہے۔[3]

حافظ کے یہاں اجتماعی پہلو اس لیے نمایاں ہے کہ جب ابو العلاء معری کا دیوان لزومیات شائع ہوا تو انھوں نے اس کا بیشتر حصہ یاد کر لیا تھا۔ لیکن معری کے یہاں جو فلسفیانہ افکار ملتے ہیں حافظ کی رسائی وہاں تک نہیں ہو سکی ہے، حافظ کے کلام پر معری

---

[1] وحی القلم۔ ۳/ ۳۱۲ [2] ایضاً۔ ۳/ ۳۱۲ [3] ایضاً۔ ۳/ ۳۱۶، ۳۱۷ و ۳۱۸۔

کے علاوہ بارودی کا اثر بھی ہے۔[1] حافظ کی شاعری زبان و بیان کے لحاظ سے قابل قدر ہے مگر فلسفیانہ شاعری کی طرح ان کی غزلیہ شاعری میں بھی کوئی انفرادیت نہیں البتہ ان کی مدحیہ شاعری میں حقائق ملتے ہیں۔[2]

رافعی نے مشہور شاعر شوقی پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ وہ مصری زندگی کے مختلف پہلوؤں پر نغمہ سرا ہوئے، اگر یہ کہا جائے کہ مصر، نیل اور قاہرہ کا دوسرا نام شوقی ہے تو یہ مبالغہ نہ ہوگا۔[3] مصر کے شعراء میں ان کی حیثیت وہی ہے جو سورج کے سامنے چراغ کی ہوتی ہے، شوقی کی شاعری میں جو عظمت و وسعت ہے وہ دوسروں کے یہاں مفقود ہے۔ کمیت کے لحاظ سے بھی ان کی شاعری دوسروں سے کہیں زیادہ ہے اسی لیے اہل مصر ان کی عظمت کے قائل ہیں، وہ ابو تمام، بحتری، معری، ابن رومی اور دوسرے شعراء کے خوشہ چیں ہیں۔ کبھی وہ ان کے برابر اور کبھی ان سے آگے نکل جاتے ہیں۔ وہ متنبی کا تتبع نہیں کرتے۔[4]

شوقی کے اکثر قصائد میں غضب کی موسیقی ہے، لیکن ان کی شاعری عیوب سے خالی نہیں۔ اس کا ایک حصہ پڑھ کر گرانی محسوس ہوتی ہے، تکرار کی کثرت بھی گراں معلوم ہوتی ہے۔ ایک ہی شعر قدرے رد و بدل کے ساتھ مختلف قصائد میں پایا جاتا ہے[5] مثلاً

وانما الامم الاخلاق ما بقیت   فان ھمو ذھبت اخلاقھم ذھبوا[6]

یہی شعر معمولی رد و بدل کے ساتھ تین جگہ اور آیا ہے۔

وانما الامم بالاخلاق ما بقیت   فان تولت مضوا علی آثارھا قدما

---

[1] وحی القلم۔ ۳/ ۳۲۱ [2] ایضاً۔ ۳/ ۳۲۶ [3] ایضاً۔ ۳/ ۳۳۱ [4] ایضاً۔ ۳/ ۳۴۴ [5] ایضاً۔ ۳/ ۳۶۳ [6] احمد شوقی۔ الشوقیات۔ بیروت۔ دار الکتاب العربی (بدون تاریخ) ۱/ ۳۱۷ [7] ایضاً۔

کذا الناس بالاخلاق یبقی صلاحہم — ویذھب عنہم امرھم حین تذھب[۱]

ولا المصائب اذ یرمی الرجال بہا — بقاتلات اذا الاخلاق لم تصب[۲]

امرؤالقیس کی شعری خصوصیات پر بھی رافعی نے روشنی ڈالی ہے اور اسے عربی شاعری کا امام اور الفاظ و تراکیب کا موجد قرار دیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ بعد کے شعرا نے اس کی پیروی کرکے اپنی شاعری میں اضافے کیے، اس کا نام ہمیشہ باقی رہے گا، اس کے یہاں تشبیہات، استعارات کی کثرت اور بلاغت کی خوبیاں گوناگوں ہیں۔

امرؤالقیس نے اپنی محبوبہ کو بیضۃ الخدر کہہ کر جس انداز سے اس کی تعریف کی ہے وہ بے مثال ہے، بیضۃ الخدر کی ترکیب سے محبوبہ کے حسن وجمال کے علاوہ یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ اس کے اردگرد پہرہ رہتا ہے، چنانچہ آگے کہتا ہے۔

تجاوزت احراسا الیہا و معشرا — علی حراصا لو یسرون مقتلی[۳]

(ترجمہ) پہرے داروں سے گزر کر میری اس تک رسائی ہوئی اور کچھ لوگ مجھے خاموشی سے قتل کردینا چاہتے تھے۔

رافعی کے اس مقالہ سے امرؤالقیس کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔

علی محمود طٰہٰ کے دیوان "الملاح التائہ" کے حوالہ سے ان کی شاعری پر روشنی ڈالی ہے، وہ پیشہ کے لحاظ سے انجینئر تھے، لیکن ان کے شاعرانہ کمالات کے سامنے انکی انجینئرنگ ماند پڑ گئی، یہی وجہ ہے کہ جدید شعراء میں انہیں نمایاں درجہ حاصل ہوا۔ اسی ضمن میں انہوں نے متشاعر اور شاعر کا فرق بھی واضح کیا ہے، شاعر کے یہاں جو حقائق

۱ احمد شوقی۔ الشوقیات۔ بیروت۔ دار الکتاب العربی (بدون تاریخ)۔ ۱/ص ۴۴ ۲ ایضاً۔ ص ۳۰ ۳ دیوان امرء القیس۔ دار بیروت۔ بیروت۔ ۱۹۵۸ء۔ ص ۳۹۔

اور قلبی کیفیات پائی جاتی ہیں وہ متشاعر کو کہاں نصیب ہوتی ہیں، علی محمود طٰہٰ واقعی شاعر تھے، انہیں حسن و قبح کی تمییز کا پورا ملکہ حاصل تھا، ان کی طبیعت کی بلندی اور فکر کی رفعت ان کی شاعری میں نمایاں ہے[۱]

گو رافعی نے علی محمود طٰہٰ کی شاعری میں روح عصر کے فقدان کا ذکر کیا ہے، تاہم انہوں نے اس کی متعدد خصوصیات بھی بتائی ہیں وہ ان کے مخصوص لہجہ، خوبصورت انداز بیان اور منظر نگاری کے مداح ہیں اور کہتے ہیں کہ علی محمود طٰہٰ کے یہاں شوقی، بارودی، حافظ، صبری، متنبی، بحتری، ابن رومی وغیرہ کا رنگ و آہنگ ملتا ہے[۲]

رافعی نے ابوتمام کے متعلق ابن خلکان[۳] اور بعض دوسرے مصنفین کے بیان کی تصحیح کی ہے[۴]

رافعی کے مقالات کا دوسرا مجموعہ تحت رایۃ القرآن ہے جو ۴۲ مقالات پر مشتمل ہے، اس میں قدیم اور جدید نظریات و افکار زیر بحث آئے ہیں۔ طوالت کے خوف سے یہاں صرف دو مقالوں کے مشمولات کا ذکر کیا جاتا ہے، وہ طٰہٰ حسین کی یاوہ گوئیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"طٰہٰ حسین نے قرآن کریم کی شان میں جو گستاخیاں کی ہیں وہ دراصل قرآنی اسالیب سے ان کی عدم واقفیت کا نتیجہ ہے، ان کے خیال میں توریت اور قرآن کریم میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کا جو ذکر ہے وہ نہ ان کے وجود کو تاریخی طور پر ثابت کرنے کے لیے کافی ہے اور نہ مکہ میں ہجرت کرکے آباد ہونے کے لیے، ان کے نزدیک یہ بات عرب و یہود میں تعلق اور اسلام و یہودیت میں رابطہ کو ثابت

۱ وحی القلم۔ ۳/۴۲۵ ۲ ایضاً۔ ۳/۴۲۷ و ۴۲۹ ۳ ابن خلکان۔ وفیات الاعیان۔ مکتبۃ النہضۃ المصریۃ، قاہرہ (بدون تاریخ) ۱/۳۳۴۔ ۳۴۱ ۴ وحی القلم۔ ۳/۴۴۷۔ ۴۵۱۔

کرنے کے لیے لکھی گئی ہے[1]

قرآن کریم کے لیے طٰہٰ حسین "ان یعد شا" کا لفظ استعمال کرتے ہیں، جس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ کوئی انسانی کلام ہے۔ مستشرقین اور ان کے ہم نواؤں کا بھی یہی خیال ہے کہ قرآن کریم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ہے، لیکن دشمنانِ اسلام کے ان بے بنیاد خیالات کو مسلمان کسی طرح تسلیم نہیں کر سکتے کیونکہ قرآن کریم میں مذکورہ بالا دونوں نبیوں کا ذکر موجود ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ مگر مستشرقین اس مختصر ذکر سے یہ ماننے کو تیار نہیں کہ یہ دونوں نبی تھے جنھوں نے مکہ ہجرت کی، بیت الحرام کی دیواریں اٹھائیں اور خانۂ کعبہ کو تعمیر کیا۔ اس کے ثبوت میں وہ مہمل اور جھوٹی روایات پیش کرتے ہیں۔

رافعی کہتے ہیں کہ تاریخی نصوص سے یہ ثابت ہے کہ عرب اور یہود میں کوئی عداوت نہیں تھی، ان کا طرز معاشرت اور زبان ایک تھی، اس کے باوجود مستشرقین کہتے ہیں کہ عرب اور یہود کی تہذیب و تمدن کے متعلق معلومات یکسر معدوم ہیں۔ جب کہ انہیں یہود کے اہل کتاب اور اہل علم ہونے اور اپنی بات کے لغو اور افسانہ ہونے کا علم اچھی طرح ہے

دوسرے مقالہ میں رافعی نے بتایا کہ اسلام سے طٰہٰ حسین کی عداوت تین طرح کی ہے ایک کہ ان کے خیال میں قرآن کریم ایک تراشیدہ کتاب ہے جو نہ وحی و تنزیل ہے اور نہ معجزہ؛ دوسری یہ کہ آپؐ ایک سیاسی آدمی تھے، رسالت و نبوت سے آپؐ کو کوئی واسطہ نہ تھا اور تیسری بات یہ ہے کہ صحابۂ کرامؓ، تابعینؒ اور تبع تابعینؒ نے سب کچھ خواہشاتِ نفس کی پیروی میں کیا۔ یہ باتیں طٰہٰ حسین اس لیے کہتے ہیں کہ وہ خود جھوٹے ہیں اور

[1] الادب الجاہلی۔ ص ۱۴۰، ۱۴۱۔

دوسروں کو بھی اپنا ہی جیسا تصور کرتے ہیں۔

طٰہٰ حسین کا یہ بھی خیال ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امیہ ابن ابی الصلت کی شاعری سے استفادہ کیا اور قرآن کریم کو منظوم کرنے میں آپؐ نے ان سے مدد لی۔ یہ بات انہوں نے مستشرق ہوار کے حوالہ سے کہی ہے۔ طٰہٰ حسین کی اسی طرح کی نہایت لغو اور لچر باتیں نقل کرکے رافعی نے ان کی مدلل تردید کی ہے اور بتایا ہے کہ طٰہٰ حسین کی باتوں میں سخت تضاد ہے[1]

اسلوب

مصطفیٰ صادق الرافعی فرانسیسی زبان بھی کسی قدر جانتے تھے مگر یہ واقفیت نہ جاننے کے برابر تھی۔ اس لیے انہوں نے عربی کے علاوہ کسی اور زبان سے کوئی استفادہ نہیں کیا۔ ان کی نظر میں صرف جاحظ، ابوالفرج اصفہانی اور عبداللہ بن مقفع تک محدود رہی اور وہ قدیم ادب اور قدیم اسلوب کے دلدادہ تھے اور یورپ اور امریکہ کی زبانوں کے شدید مخالف تھے، اسی شدت کی وجہ سے وہ جدید افکار و خیالات کی تردید میں کہیں کہیں حد سے تجاوز کر گئے ہیں۔ تاہم اس کے باوجود بھی انہوں نے اسلام کی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔

مصطفیٰ صادق الرافعی کی زبان کی سلاست و دلکشی اور اسلوب بیان کی لطافت و دلآویزی کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے۔

"کما تطلع الشمس بانوارها فتفجر ینبوع الضوء المسمی النهار۔ یولد النبی فیوجد فی الانسانیة ینبوع النور المسمی بالدین ولیس النهار الا یقظة الحیاة تحقق اعمالها ولیس الدین الا یقظة النفس تحقق فضائلها۔

والشمس خلقها الله حاملة طابعه الالهی فی عملها للمادة تحول به

[1] الادب الجاہلی۔ ص ۱۴۲۔

وتغیر والنبی یرسله الله حاملاً مثل ذلك الطابع فی عمله للروح تترقی فیه وتسمو

ورعشات الضوء من الشمس فی قصة الهدایة للکون فی کلام من النور

واشعة الوحی فی النبی ھی قصة الهدایة للانسان الکون فی نور من الکلام[1]

مصطفیٰ صادق الرافعی کے مقالات پر قرآن وحدیث کے اثرات نمایاں ہیں؛ انھوں نے ان کی حقانیت اور مخالفین اسلام کے شبہات واعتراضات کی تردید کو اپنا موضوع بحث بنایا ہے۔ مجموعی حیثیت سے وہ ایک علمی شخص ہیں لیکن مختلف جرائد ورسائل میں برابر لکھتے رہنے کی وجہ سے بعض وقت ان کے یہاں صحافتی انداز بھی پیدا ہوگیا ہے، ان کی تنقید میں بھی انشائیہ عنصر غالب ہے، عقاد اور طہٰ حسین وغیرہ پر جب نقد کرتے ہیں تو ان کا لب ولہجہ بہت سخت ہوجاتا ہے، ایسے موقع پر وہ جذبات کی طغیانی میں بہہ جاتے ہیں اور اعتدال پر قائم نہیں رہتے[2]

---

[1] وحی القلم۔ ۲/۳ [2] حیاۃ الرافعی۔ ص ۱۵۲۔ ۱۵۳۔

مقالاتِ شبلی

علامہ شبلی کے مذہبی، ادبی، تعلیمی، تنقیدی، تاریخی اور قومی واخباری مضامین کا مجموعہ آٹھ جلدوں میں ہے، ان میں دو جلدوں میں مولانا کے فلسفیانہ اور سوانحی مقالات بھی شامل ہیں اور جلد دوم جو ان کے ادبی مضامین پر مشتمل ہے، اس میں عربی زبان، شعر العرب، فن بلاغت جمہرۃ البلاغہ کے علاوہ ایک مضمون میں عربی اور فارسی شاعری کا موازنہ بھی کیا گیا ہے۔

قیمت اول ۴۰ روپے، دوم ۱۵ روپے، سوم ۲۵ روپے، چہارم ۲۵ روپے

پنجم ۲۰ روپے، ششم ۴۰ روپے، ہفتم ۲۰ روپے، ہشتم ۳۵ روپے

"منیجر"

خانقاہی نظام تعلیم اور اصلاحِ نسواں

اردو شاعری کے پس منظر میں

از ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط، دارودہ

اسلام کا آغاز درس وتدریس سے ہوا ہے۔ رسولِ امیؐ "فاضل مکتب حرا" نے دانشگاہ حرا سے درس اقرا لے کر جاہل ووحشی اور بگڑے ہوئے ناتراشیدہ قبیلوں کی تربیت کی؛ اپنے آپ کو مشکلات اور سختیوں میں ڈالا اور اس ذمہ داری کو پورا پورا نبھایا، یہ کوشش اللہ کے فضل سے ایسی بارآور ثابت ہوئی کہ ان غیر مہذب قبیلوں کے اندر سے اعلیٰ فطری اوصاف سے متصف "تہذیب گر" صحابۂ کرامؓ کا ایک گروہ وجود میں آیا، جنھوں نے ابنائے قوم کو تہذیب کا لباس فاخرہ پہنا کر اللہ کے محبوب بندوں کی صف میں لا کھڑا کر دیا۔ آپؐ کی تربیت واصلاح کا یہ عمل صرف مردوں کی ذات تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ آپؐ نے طبقہ نسواں کا بھی اس معاملے میں کافی خیال رکھا کیونکہ یہ اگر سنورتی ہیں تو سارا عالم سنورتا ہے۔ چنانچہ رسول مقبول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کی ایسی تربیت یافتہ جماعت تیار کرلی تھی جو گھر تو گھر میدان کارزار میں بھی عمل کا بہترین نمونہ بنیں۔ ان آبگینوں کو آپؐ نے اپنی تربیت خاصہ سے ایسا معلم بنا دیا تھا کہ مردوں نے بھی ان کے آگے زانوئے تلمذ تہ کرنے میں فخر محسوس کیا۔ سماج ومعاشرے میں کل تک جو عورت ذلت کی نگاہ سے

دیکھی جاتی تھی آج عزت ووقار کی بلندیوں پر فائز ہوئی، آپ کی تربیت نسواں کا یہ اثر تھا کہ عورت عزت کی دیوی بن گئی۔ آپ نے عورتوں کے جوہر اصلی کو نمایاں کر کے اس کی آب وتاب بڑھا دی چنانچہ خزف ریزہ سمجھی جانے والی عورت جوہر آبدار بن کر سماج میں جگمگانے لگی۔ آپ طبقہ نسواں کی تربیت واصلاح ازواج مطہرات کی معرفت کیا کرتے تھے۔

"خیر القرون" جیسا جیسا ماضی کے دھندلکوں میں بڑھتا چلا گیا، اصلاح وتربیت کی یہ روشنی بھی ماند پڑتی گئی، بالآخر مدارس ودرسگاہوں سے ہٹ کر اپنی خانقاہوں میں مشائخ نے اس نظام کو چلایا، اس میں کوئی منظم، باضابطہ اور مجوزہ نصاب نہیں تھا۔ مریدین کے لیے اذکار واوراد اشغال ومراقبہ، صوم وصلوٰۃ اور قرأت قرآن جیسے امور تھے جن پر سختی سے متواتر مشق کرائی جاتی تھی، جس کی وجہ سے خانقاہوں میں تقشف اور تکدر کی فضا بالعموم پائی جاتی تھی۔ اس بوجھل فضا کو مباحات کے دائرے میں ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ کے ذریعہ خوشگوار بھی بنایا جاتا تھا۔ اس نوع کے کئی واقعات مسیح الامت حضرت مولانا شاہ مسیح اللہ خاں صاحب کے ملفوظات میں بیان ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں مردوں کی اصلاح نفس کے لیے یہ بزرگان دین کوشاں تھے وہاں عورتوں کی تربیت کی فکر بھی انکے دامنگیر رہتی تھی،

بادشاہوں کی حکومت خَلق پر ہوتی ہے اور صوفیائے کرام خُلق پر حکمرانی کرتے ہیں خلق کی اصلاح زجر وتوبیخ کے زور پر تو ہوسکتی ہے لیکن خُلق کی اصلاح مجاہدے اور ریاضت کے بغیر ممکن نہیں۔ یوں بھی نفوس انسانی کے اخلاق وکردار کی تہذیب وتعمیر اس عالم رنگ وبو میں انتہائی مشکل کام ہے۔ اگر زیر تربیت طبقہ جاہل اور سادہ لوح عوام کا ہو تو اصلاح کا یہ کام اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن انسانیت کا سب سے اہم اور مقدم فریضہ یہی ہے۔

اسی لیے بزرگان دین نے اس کام کو بحسن وخوبی انجام دینے کے لیے مختلف طریقوں کا استعمال کیے۔

عوام کی اصلاح کے لیے مشائخ نے سب سے پہلے اس بات کا جتن کیا کہ ابنائے قوم کی مقامی زبان کو وسیلۂ اظہار بنایا اور اپنی تعلیمات کو مقامی رنگ ثقافت میں پیش کرنے کی سعی فرمائی یہ محض ضرورت تھی مقصد نہیں تھا۔ آج جب ہم صوفیائے کرام کی تعلیمات میں مقامی اثرات کا جائزہ لیتے اور انہیں مقصد کے خانے میں رکھ کر دیکھتے ہیں تو ہمیں ان کی تعلیمات میں کجی اور شریعت سے دوری نظر آتی ہے۔

ہندوستان میں صوفیائے کرام نے یہاں کی عوامی زبان کو وسیلۂ اظہار بنا کر اپنی تعلیمات کو فروغ دیا، یہی وجہ ہے کہ اردو ادب وزبان کی نشو ونما میں خانقاہوں کی خدمات نظر انداز نہیں کی جاسکتیں۔ شاعری کی نشو ونما تو خانقاہوں ہی میں ہوئی۔ اذان وتکبیر کی آواز سے اس کے کان یہیں آشنا ہوئے۔ اللہ ھو۔ اللہ ھو کی لوریاں اسے یہیں سنائی دیں۔ اللہ والوں نے قصے کہانیاں اسے یہیں سکھلائے۔ "آنکھ مچولی" اور "پھگڑی" جیسے کھیلوں میں اسے رجھایا گیا، لبھایا گیا اور جب یہ سیانی ہو گئی تو مجاز وحق کے پردوں میں اسے عشق کے رموز سمجھائے گئے اور نت سہاگن بنی رہنے کے لیے "سہاگن ناموں"، "سکھی ناموں"، اور "لگن ناموں" سے اس کی گود بھری گئی، غرض کہ اردو شاعری کو بنانے، سنوارنے اور اس کے صوری ومعنوی حسن کو بڑھانے کے لیے خانقاہوں میں کوششیں کی گئیں۔

بنت الادب شاعری کی تحسین وتہذیب کی طرح بنات قوم کی اصلاح وتربیت کی فکر بھی خانقاہوں میں پروان چڑھی، مشائخ وصوفیہ نے تعلیم نسواں کے لیے ان ہی کی زبان اور ان ہی کے مزاج وپسند کا خیال رکھا انھوں نے پند ومواعظ کے بوجھل اور غیر موثر وغیر جاذب طریقے سے بڑی حد تک ہٹ کر پُر اثر طریقہ کو اپنایا اور کھیلوں اور

گھریلو کام کاج کو وسیلۂ درس بنایا۔

آدمی بالطبع تفریح پسند واقع ہوا ہے۔ اس کی جبلت حظ اور ذوق مزاح اسے دلچسپ اور پُر لطف تفریحی وسائل کی طرف راغب کرتے ہیں۔ متوازن اور منصوبہ بند زندگی میں جبلت حظ اللہ کی نعمت ہے کہ اگر یہ قوت آدمی کو نہ ملتی تو زندگی بوجھ بن جاتی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انبیائے کرامؑ میں سب سے زیادہ ستائے گئے نبیؐ، سب سے زیادہ اللہ کا خوف رکھنے والے پیغمبر اور امت کے غم کو جزو حیات بنا کر زندگی گزارنے والے رسولؐ نے باوجود بھاری بھرکم ذمہ داریوں کو قبول کرنے کے زندگی کے نقشے میں مسکراہٹوں کے لیے جگہ پیدا کر لی تھی۔ فرائض حیات کے افکار سے شکن آلود چہروں کو تبسم ریز کرنے کے لیے آپؐ کھیلوں اور مقابلوں میں شریک ہوتے تھے اور خود ہنس کر دوسروں کو ہنسایا کرتے تھے۔ کھیلوں اور مقابلوں کا ایک مقصد تربیت بھی ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ آپؐ نے تیر اندازی کے مقابلوں میں حضرت صہیبؓ، حضرت رافع اور حضرت سلمہ بن اکوعؓ جیسے تیر انداز تیار کیے جن کی تیر اندازی پورے عرب میں مشہور تھی۔ پس کھیلوں کے اس مقصد کے پیشِ نظر T.P.NUNN جیسے ماہر تعلیم کو کہنا پڑا:

"آدمی کی تخریب پسندی کو صرف کھیل کے ذریعہ دور کیا جا سکتا ہے"[1]

سٹینلی ہال (Stanley Hall) کے نزدیک "کھیل کے ذریعہ تجربات حیات کا اعادہ کیا جاتا ہے۔"[2] اور ارسطو کے "cathartic" نظریے کے مطابق "کھیل کے ذریعہ

[1] S.S. MATHUR: EDUCATIONAL PSYCHOLOGY AGRA 1974-P.72-

[2] BHATIYA & BHATIYA: THE PRINCIPLES OF METHODS OF TEACHING DELHI-P.204

بچوں کی بری عادتوں کو ختم کیا جا سکتا ہے۔"[1]

مندرجہ بالا فلاسفہ قدیم و جدید کے یہاں کھیل "اصلاح" کا ایک ذریعہ قرار پاتا ہے۔ صوفیائے کرام نے بھی اصلاح نسواں کے لیے "کھیل" کو بھی ایک وسیلہ بنایا ہے۔ چنانچہ علاقہ گجرات کے صوفی کبیر حضرت شاہ علی محمد جیوگام دھنی (م ۱۵۶۵ء) کی کتاب "جواہر اسرار اللہ" میں ایک نظم ملتی ہے۔ اس میں آنکھ مچولی کے کھیل کے ذریعہ تربیت نسواں کے پہلو نکالے گئے ہیں۔ علی محمد جیوگام دھنی کا سارا کلام واردات قلبی اور "من عرف نفسہ" کی تفسیر ہے۔ وہ تصوف کے حقائق کبھی تو ابہام کے پردوں میں پیش کرتے ہیں، کبھی قصے کہانیوں میں، کبھی پہیلی کے رنگ میں "صبغۃ اللہ" کی دعوت دیتے ہیں اور کبھی آنکھ مچولی کے کھیل میں عرفان ذات میں حائل پردوں کو آنکھوں سے ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ متذکرہ پوری نظم میں خطاب عورت کی طرف سے ہے اور جگہ جگہ یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ ذات حقیقی کو پانے کے لیے دنیا کی ساری چیزوں سے نظریں ہٹانی ہوں گی، یہاں تک کہ اپنے آپ کی بھی نفی کرنی ہو گی، ایک وقت آئے گا کہ پھر ہم اپنے ساتھی کو بوجھ (سمجھ) لیں گے، جو ہماری شہ رگ سے بھی قریب ہمارے اندر چھپا ہوا ہے۔

ہوں تجہ بوجھوں میرے ساتھی
کہہ کس آگھی یہ توں باتی (جواہر اسرار اللہ (قلمی) ورق ۴۴ (الف)

اسی کھیل کو بیدر (دکن) کے مشہور بزرگ صوفی حضرت شاہ ابوالحسن (م ۱۶۳۵ء) نے بھی اصلاح نسواں کے لیے وسیلۂ درس بنایا ہے۔ انھوں نے اپنی تصنیف "سکھ انجن" میں مختلف اسباق ہی تیار کر لیے ہیں۔ اس کھیل کی توضیح شاہ ابوالحسن نے یوں کی ہے ؎

[1] S.S. MATHUR: EDUCATIONAL PSYCHOLOGY-P.72

کھیل میں ایسا کھیل ہووے پیا ملن کا میل ہووے
جس کوں یہ کھیل سوجے گا پیو کی مارگ بوجے گا
یو کھیل ہمارا اے لوگو آپ کو آپس میں دیکھو[1]

شاہ صاحب نے آیات قرآنیہ و احادیث کو بھی اپنے اشعار میں سمویا ہے۔ مثلاً ایک جگہ آیت کریمہ "فَسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ" (سورہ نحل آیۃ ۴۳) کا لفظی ترجمہ ہی شعر میں پیش کر دیا ہے۔

جانے ہوں تو بوجو پیارے انجانے تو پوچھو پیارے[2]

دراصل آنکھ مچولی کا کھیل "اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ" کی تفسیر اور سنت ابراہیمؑ کی تمثیل ہے۔ اس میں اطراف و اکناف کی ساری چیزوں سے آنکھیں موند کر توجہ ہٹالی جاتی ہے اور صرف ایک ہی کو مرکز توجہ بنایا جاتا ہے اور اسے پہچاننے اور حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، دوسری طرف یہ کھیل سنت رسولؐ کی بھی تمثیل ہے۔ ایک بار آپ نے ازراہِ مذاق زاہر نامی ایک شخص کی آنکھیں بیچ بازار میں موند کر پوچھا تھا کہ بتاؤ میں کون ہوں؟ زاہر پہلے تو کچھ نہ سمجھ سکے بعد میں آپؐ کو پہچان لیا تو فرط شوق میں اپنے کندھے حضورؐ کے سینۂ مبارکہ پہ ملتے رہے۔ ترمذی کی اس روایت سے آنکھ مچولی کے کھیل پہ استدلال کیا جا سکتا ہے، کیونکہ اس کھیل میں کم و بیش وہی امور عمل میں لائے جاتے ہیں جو حضورؐ نے زاہر کی آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کر کیے تھے۔

"بھگڑی" بھی ایک نسوانی کھیل ہے۔ اس میں دو عورتیں ایک دوسرے کے ہاتھ

---

[1] شاہ ابوالحسن: "سکھ انجن" (مخطوطہ) ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد (مختلف اوراق) ۱-ب

[2] ایضاً، ورق ۱۲ ب۔

پکڑ کر پوری قوت کے ساتھ گول گھومتی ہیں۔ یہ اصلاً مہاراشٹرین کھیل ہے اور عورتوں میں از حد مقبول۔ برادران وطن کے یہاں اسے مذہبی تقدس حاصل ہے، صوفیائے کرام نے عورتوں کی اس کھیل سے دلچسپی دیکھ کر اسے وسیلۂ تربیت بنا لیا۔ دکنی اردو میں مجھے تین بھگڑی نامے دستیاب ہوئے ہیں۔ سید اصغر علی کی کتاب "رمزۃ العاشقین" میں اثنا عشری عقاید کو بھگڑی کھیل میں واضح کیا گیا ہے۔ شاعر نے حبِ علی اور حبِ رسول کی تعلیم دی ہے۔ دوسرا بھگڑی نامہ دکن کے قدیم شاعر فرید کا ہے، انھوں نے اسرار تصوف بھگڑی کے ذریعہ بیان فرمائے ہیں۔ مثلاً ایک شعر میں کہتے ہیں:

آری سہیلی بھگڑی کھیل ہو ہو ہو سے دم کو جھیل[1]

اس شعر میں پاس انفاس یعنی "ذکر دم" کی طرف اشارہ ہے۔ خانوادۂ چشتیہ میں تمام اذکار میں "ذکر دم" کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ ذکر دم سانس اندر لیتے ہوئے "اللہ" اور خارج کرتے ہوئے "ہو" کہنے کا نام ہے۔ اس طرح سانس کی آمد و رفت میں اللہ ہو۔ اللہ ہو کی آواز بلند ہوتی چلی جاتی ہے۔ بہ آواز بلند اسے پڑھا جائے تو اسے ذکر جلی کہا جاتا ہے۔ بعض صوفیوں کے نزدیک سانس کی آمد و رفت میں اللہ۔ اللہ کا ورد بتایا گیا ہے اور بعضے "ہو ہو" کو ترجیح دیتے ہیں، اگر "حبس دم" کا خیال رکھا گیا تو یہ ذکر نہایت پُر تاثیر ہو جاتا ہے۔ اب یہ حقیقت جان لینا ضروری ہے کہ بھگڑی میں چونکہ پوری قوت سے گھوما جاتا ہے اس لیے سانس پھولنے لگتا ہے اور "ہو ہو" کی آواز منہ سے نکلنے لگتی ہے۔ فریدؔ نے اس نکتہ کو دھیان میں رکھ کر عورتوں کو بھگڑی کے ذریعہ "ذکر دم" کی مشق کرائی ہے۔

---

[1] فرید: "بھگڑی نامہ" (مخطوطہ) کتب خانہ سالار جنگ، میوزیم حیدرآباد، ورق ۴ ب۔

تیسرا "پھگڑی نامہ" فقیر اللہ شاہ کا ہے جو قادریہ سلسلے کے مشہور دکنی بزرگ حضرت مولانا شاہ رفیع الدین قندھاری کے مریدوں میں سے تھے۔ فقیر اللہ شاہ نے اپنے پھگڑی نامہ میں راہِ مستقیم پر پاؤں جمائے رکھنے کا درس دیا ہے۔ یاد رہے کہ پھگڑی کے کھیل میں زمین پر پاؤں کا جماؤ اور پشت کی جانب پورا جھکاؤ نیز جسم کے صحیح توازن کو نہایت اہمیت ہوتی ہے، ورنہ ہاتھوں سے ہاتھ چھوٹ کر دور پھینکے جانے کا خدشہ رہتا ہے۔ راہ مستقیم پر چلتے ہوئے بھی اگر نفس وشیطان کے وساوس سے پاؤں ڈگمگا جائیں اور اللہ کی رسی ہاتھ سے چھوٹ جائے تو دوزخ کے عمیق گڑھوں میں گرنے کا خدشہ رہے گا۔ فقیر اللہ شاہ نے یہی بات اپنے پھگڑی نامے میں بتائی ہے۔

آؤ سہیلی پھگڑی کھیل ہاتھ میں ہاتا دے کر سیل
ثابت راہ میں پاؤں پیل کاں کا ہا ہو یو ا کھیل
کیا کیا ہیگا رد و برد
لا الٰہ الا ہو

صوفیائے کرام نے گھروں کے مشکل کاموں کو سہل اور تفریحی بنانے کی بھی کوشش کی ہے، جیسا کہ پچھلے زمانے میں چکی کا پیسنا عورتوں کے لیے نہایت مشکل کام تھا۔ اس کام کو تفریحی بنانے کیلئے صوفیائے کرام نے چکی کے گیت ترتیب دیے جو "چکی ناموں" کی شکل میں ملتے ہیں، ان میں تفریح کے ساتھ درسِ دین کے حصول کا بھی اہتمام ملتا ہے۔ ایسے چکی ناموں میں حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودراز سے منسوب ایک چکی نامہ ہے۔ اس میں دین کی باتیں اس انداز سے سمجھائی گئی ہیں کہ عمل کرنے کی رغبت پیدا ہوجاتی ہے۔ خواجہ صاحب کہتے

[1] فقیر اللہ شاہ: پھگڑی نامہ (مخطوطہ) کتب خانہ آصفیہ (حالیہ محکمۂ آثار قدیمہ) حیدرآباد ورق ۲ الف۔

ہیں کہ "تن (جسم) کی چکی کو شریعت کے مرکزی کیل پر اللہ کے دستے کے سہارے اتنا گھماؤ کہ سوکن (شیطان) کھینچتے کھینچتے تھک جائے۔ عمل کے دانے چکی میں ڈالو گے تو نیکیوں کا آٹا نکلے گا۔ اس میں اخلاص وصفات کا "پورن" بھرو اور بہشت کے میووں کا مزہ چکھو۔ خواجہ صاحب کی یہ پوری نظم اسی طرح سے تمثیلی پیرایے میں ترتیب دی گئی ہے۔

خواجہ صاحب کے "چکی نامہ" کے علاوہ میرانجی خدانما، میراں اور فاروقی کے چکی نامے بھی ملتے ہیں۔ خدا نما کے علاوہ باقی دونوں کے چکی ناموں میں صوتی آہنگ کی روانی ہے جس کی وجہ سے ان میں ترنم اور نغمگی پیدا ہوگئی ہے جو گیتوں کی روح ہوتی ہے۔ میراں کے چکی نامہ کی ہیئت "مسمط" کی اور فاروقی کے چکی نامے میں ترجیع بند کا استعمال ہونے کی وجہ سے بھی دونوں میں نغمگی پیدا ہوگئی ہے۔

عورتیں عموماً رسم ورواج پسند ہوتی ہیں، اس لیے صوفیائے کرام نے "سرِ دلبراں" کو رسموں کے پردے میں بیان کیا ہے۔ پروفیسر مجید بیدار نے خواجہ بندہ نواز گیسودراز کے والد حضرت سید یوسف حسین حسینی معروف بہ شاہ راجو قتال (م ۷۳۱ھ) سے منسوب "سہاگن نامہ" کی بازیافت کی ہے۔ اس میں حضرت والا نے اپنی اہلیہ کے لیے پند و مواعظ منظوم کیے ہیں۔ اگر یہ مثنوی واقعی شاہ راجو قتال کی محقق ہوجائے تو اصلاحِ نسواں کا اردو میں اولین ادب پارہ قرار پاسکتی ہے۔

شاہ غلام حسین ایلچپوری (م ۱۲۱۱ھ) نے بھی اصلاحِ نسواں کے لیے مختلف کتابیں ترتیب دی تھیں، ان کی لگن نامہ، جھولنا نامہ اور سکھی نامہ اسی نوع کی مثنویاں ہیں۔ لگن نامہ ایک قسم کی تمثیل ہے جس میں شیطان کو سوکن، دنیا کو میکا اور آخرت کو سسرال سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سسرال میں وہی عورت کامیاب زندگی گزار سکتی ہے جس نے میکے ہی میں زندگی

گزارنے کا ڈھنگ اور سب کے دل جیت لینے کا ہنر سکھ لیا ہو، اس دنیا کے میکے میں جس نے اچھی زندگی گزاری ہو گی سسرال یعنی آخرت میں پیو (خدا) کی منظور نظر بن سکے گی۔ اس کا پیو اس سے راضی ہوگا اور جنت کے گھر میں ساری نعمتوں سے متمتع ہو گی۔ شاہ غلام حسین کے اس لگن نامے میں ہندی کے آسان، نرم اور مناسب لفظوں نے غضب کا رس اور ترنم پیدا کر دیا ہے۔ ان کے علاوہ شیخ فرید گنج شکر سے منسوب "جھولنا نامہ" اور شیخ محمود خوش دہاں (م ۱۶۱۴ء) کا "لوری نامہ" بھی اسی قبیل کی نظمیں/مثنویاں ہیں۔

اردو شاعری میں ہندوستانی عناصر ڈھونڈھنے والے اس بات کو بحسن و خوبی جانتے ہیں کہ یہاں کے تہواروں میں مذہبی یک رنگی اور مختلف روایات کا سنگم دکھائی دیتا ہے۔ ایک عجیب بات اور بھی ہے کہ یہاں کے خدا ترس لوگوں اور صوفیائے کرام کے کلام میں بھی ان تہواروں کی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان لوگوں نے بالخصوص ہولی کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ شاید قرآنی اصطلاح "صبغۃ اللہ" کی عملی تفسیر و توضیح اس تہوار سے بآسانی ہو سکتی ہے۔ ان تہواروں کے سہارے صوفیائے کرام نے اصلاح نسواں کی بھی سعی فرمائی ہے۔ چنانچہ علاقہ پنجاب کے ایک قدیم صوفی شاعر بلھے شاہ (م ۱۷۵۰ء) کے یہاں یہ کافی ملتی ہے۔

ہوری کھیلوں گی کہہ بسم اللہ

نام نبی کا رتن چڑھی بوند پڑی اللہ اللہ　　رنگ رنگیلی اوہی کھلاوے جو سکھی ہوئے فنا فی اللہ

ہوری کھیلوں گی کہہ بسم اللہ[1]

شمالی ہند کے بزرگ صوفی شاعر شاہ نیاز احمد بریلوی (م ۱۸۳۴ء) کی ہولی کے تہوار پر

---

[1] ماخوذ از تاریخ ادب اردو: جمیل جالبی حصہ اول۔ دہلی ۱۹۷۷ء ص ۶۵۳۔

لکھی گئی نظموں میں اسلامی معاشرے کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔

ہوری ہوئے رہی احمد جیو کے دوار　　نبی علی کوں رنگ بنو ہے حسن حسین کھلار

ایسو انوکھو چتر کھلاری رنگ لیو سنسار　　نیاز پیاری بھر بھر چھڑکے ایک ہی رنگ پچکار[2]

ہولی کی ان نظموں میں بھی تخاطب عورت ہی کی جانب سے ہے۔ بایزید بسطامیؒ نے متصوفانہ ادب میں سب سے پہلے "عرائس اللہ" کی اصطلاح استعمال کر کے عورت کو ادب میں کھینچ لائے ہیں۔ اس وقت سے آج تک متصوفانہ ادب میں معشوق کے پردے میں عورت برابر دکھائی دے رہی ہے۔ بہرحال! صوفیائے کرام نے "عرائس اللہ" کی اصطلاح سے استدلال کر کے اصلاح نسواں کی کوشش کی ہے اور ادب میں پوری طرح اس کا استعمال کیا ہے۔

ان نظموں کے علاوہ خالصتاً ناصحانہ انداز میں لکھی گئی مثنویوں میں بھی عورتوں کی اصلاح کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ لیکن واعظانہ طرز بیان نے ان کے شعری حسن کو مجروح کر دیا ہے، جس کی وجہ سے ادب میں وہ اونچا مقام حاصل نہ کر سکیں۔ ان شواہد کی موجودگی میں اتنا کہا جا سکتا ہے کہ صوفیائے کرام نے خانقاہوں میں مرتب کردہ غیر مجوزہ نصاب کے ذریعہ تربیت نسواں کے فرض کو نبھانے کی سعی کی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اس غیر منظم نصاب سے عورتوں کی اصلاح ہوئی ہے۔

---

[2] شاہ نیاز احمد بریلوی (ڈاکٹر انوار الحسن لکھنؤ یونیورسٹی) دیوان نیاز احمد بریلوی۔ لکھنؤ، ۱۹۷۶ء ص ۱۴۳۔

اخبار علمیہ

گذشتہ پچاس برسوں سے علم فلکیات کے ماہرین اس تحقیق وجستجو میں سرگرداں ہیں کہ سورج اور نظام شمسی کے دوسرے سیاروں کے اندرون میں کیا کیا تغیرات رونما ہو رہے ہیں، اس تلاش میں ان کو جو معلومات حاصل ہوئے ہیں ان سے اب یہ یقین پختہ ہوتا جا رہا ہے کہ چند بلین (کروڑوں برسوں) کے بعد سورج اچانک پھیل کر پورے کرۂ ارض کو نگل لے گا، امریکہ کے سائنسی مجلہ اسٹروفزیکل جرنل کے ایک تازہ تجزیہ میں اس سلسلہ میں چند دلچسپ انکشاف کیے گئے ہیں مثلاً زمین کم از کم ایک بلین اور ایک ملین سال تک بود و باش کے لائق رہے گی، اس قسم کے تخمینے گذشتہ تخمینوں سے زیادہ الگ نہیں ہیں، سورج کی عمر ساڑھے چار بلین سال ہو چکی ہے اور اس کے آخری غروب میں ابھی قریباً اتنا ہی عرصہ اور درکار ہے، سائنس دانوں کا خیال ہے کہ ایک وقت آئے گا جب سورج ایسے ستاروں اور سیاروں کے زمرہ سے الگ ہو گا جو نسبتاً زیادہ بڑے اور طاقتور ہیں، اس وقت وہ ڈرامائی طور پر پھیل کر گویا سرخ عفریت بن جائے گا یعنی اس کے موجودہ حجم میں چار سو آتشی چادروں کا اضافہ ہو گا، ان کی وجہ سے وہ اس قدر ضخیم ہو گا کہ زمین کے خلا تک پہونچ جائے گا، اس وقت سورج کا قطر ۱۴ ملین کیلومیٹر ہے اور زمین سے اس کا فاصلہ ۱۵۰ ملین کیلومیٹر ہے اور اس سے برقی ذرات کی ایک کثیف چادر کی شکل کے شمسی بگولے خارج ہوتے رہتے ہیں، ان کی رفتار آواز کی رفتار سے کہیں زیادہ ہے اور یہ پورے نظام شمسی میں

پھیلتے رہتے ہیں، ان کے ذریعہ قریباً ایک ملین ٹن ہائیڈروجن ہر سکنڈ پر خارج ہوتی رہتی ہے، سائنس دانوں کے خیال میں یہی شمسی گولے جمع ہو کر آتشی چادروں کی شکل اختیار کر کے سورج کے حجم کو اتنا ضخیم بنا دیں گے کہ وہ زمین کے علاوہ مریخ اور زہرہ کو بھی نگل جائیگا۔

ان ماہرین فلکیات کا ایک خیال یہ بھی ہے کہ جس وقت یہ سورج اپنی انتہائی وسعت کو پہونچے گا تو یہ شمسی برقی ذرات کی چادر اس کی کمیت یا ذخیرہ سے چالیس فیصد توانائی خارج کرے گی، اس کا مطلب یہ ہوا کہ سورج اپنے نظام کے دوسرے سیاروں کی کشش ثقل کا زور کچھ کم کر دے گا جس کی وجہ سے یہ سیارے ایک مستدیر خط حرکت میں اس سے دور ہو جائیں گے، یعنی زہرہ جو اس وقت سورج سے ۱۰۸ ملین کیلومیٹر کے فاصلہ پر ہے اس وقت ۱۸۰ ملین کیلومیٹر کے فاصلہ پر ہو گا، زمین کا معاملہ بھی یہی ہو گا یعنی موجودہ فاصلہ کے مقابلہ میں یہ مسافت ۲۷۵ ملین کیلومیٹر کی ہو جائے گی، لیکن ایک سائنس داں نے اس نظریہ کے متعلق کہا کہ کوئی واضح طور پر نہیں جانتا کہ سورج اپنی توانائی کو کس قدر خارج کرے گا یا اس کے ذخیرۂ توانائی میں مسلسل کمی کی وجہ سے خود اس کا پھیلاؤ بڑھے گا یا نہیں؟ یا سورج زمین کو مکمل طور پر نگل لے گا یا کچھ حصہ بچ جائے گا؟ لیکن اتنا طے ہے کہ کرۂ ارض کا درجۂ حرارت ۱۳۰۰ ڈگری سینٹی گریڈ تک پہونچ جائے گا جس سے اس کی سطح پگھلی ہوئی دھات کی سرخ دہکتی چٹان کے مانند ہو جائے گی اور اس میں زندگی اور حیاتیاتی نمو کا ادنی امکان بھی نہ رہے گا، زمین کا وجود اگر باقی بھی رہے گا تو صرف ایک ملبہ کی شکل میں یا محض خاکستر کی صورت میں؟ سائنس داں کارل سارگن نے اس تباہی سے بچنے کا امکان یہ کہہ کر ظاہر کیا کہ ممکن ہے بنی نوع انسان اس وقت تک ترقی کے اس مقام پر پہونچ جائے کہ وہ ان تغیرات پر بھی قابو پا لے یا

اس پر کسی طرح اثر انداز ہو؟ اس امکان کے متعلق ایک سائنسداں نے ازراہ مذاق
یہ کہا کہ شاید ان کا یہ مطلب ہے کہ انسان اپنے مال و اسباب کو لے کر کسی اور سیارے
پر ڈیرہ ڈالے گا یا سائنسداں کسی اور سیارے کو تلاش کر کے اسے زندگی کے لائق بنا
دیں گے کہ ستاروں کے آگے جہاں اور بھی ہیں۔

گذشتہ دنوں مصر میں ماہرین آثار قدیمہ کو قدیم مصر کی تاریخ کی بازیافت کے
سلسلہ میں ایک نمایاں کامیابی حاصل ہوئی، قاہرہ کے جنوب میں جیزہ کے قریب
زراعۃ اور قدیم ملوک مصر کا وسیع و عریض قبرستان سقارہ ہے، آندھیاں اس پر
ہزاروں سال سے ریت اور خاک ڈالتی رہیں اور وقت کے امتداد سے قبریں دبیز
تہوں میں جا کر بے نام و نشاں ہوتی گئیں، کھدائی کے دوران گلیوں کی شکل میں ایک
مقبرہ کے بعد دوسرا مقبرہ ملتا جاتا ہے۔ اب آسٹریلیا اور مصر کے ماہرین کو سقارہ
میں ایک چھوٹا لیکن صد درجہ مزین و منقش مقبرہ ملا ہے، یہ NADJET-M-PET
نامی ایک عورت کا مقبرہ ہے جو تیت کے نام سے مشہور تھی، ماہرین کو حیرت ہے کہ
یہ عورت اس خطہ میں کیسے دفن کی گئی جو مردوں کے لیے خاص تھا، اس کے آس
پاس تمام مقبرے مردوں کے ہیں اور یہ عموماً وہ لوگ ہیں جو ساڑھے چار ہزار سال
پہلے تیتی فرعون کے عہد میں سربرآوردہ اور صاحب اثر و رسوخ تھے، ان کے درمیان
تیت کا یہ مقبرہ کسی عورت کا تنہا دفینہ ہے۔ تاریخ مصر کے ماہرین تیت کی شخصیت
کا راز معلوم کرنا چاہتے ہیں لیکن تاریخ کی گذرگاہوں میں شاید ہی اس کا جواب مل سکے،
تاہم یہ بات صاف ہے کہ یہ عورت غیر معمولی حیثیت کی تھی اور فرعون کے دربار میں
اس کا درجہ و مرتبہ نمایاں تھا، فرعون کے اہرام کے باب الداخلہ پر اس عورت کا

دفن کیا جانا اس بات کا سب سے بڑا ثبوت ہے، ۱۳ فٹ طویل اور ۶ فٹ عریض اس دفن
کے بہت سے عمدہ اور نفیس نقوش اس لیے مٹ گئے کہ ہزار سال بعد ریت میں اس
مقبرہ کے چھپ جانے کے بعد ٹھیک اس کے اوپر ایک مقبرہ بنا دیا گیا تھا جس کی وجہ
سے زیر زمین تیت کے مقبرہ کے بالائی حصہ کو نقصان پہنچا تھا، تاہم جو بچ گیا اور اب
دریافت ہوا اس میں چونے کے سفید پتھر کی ایک طویل و عریض ترشی ہوئی سل ہے
جو چٹان کی مانند پشت کی دیوار کو ڈھانپے ہوئے ہے اور اس پر قدیم مصر کے تصویری
حروف نہایت خوبصورت شکل میں کندہ ہیں، ماہرین حفریات اس حجری دیوار کو چور
دروازہ تصور کرتے ہیں کیونکہ قدیم مصریوں کے عقیدہ کے مطابق روحیں اسی چور دروازہ
سے نکل کر چڑھاوے اور نذریں قبول کرتی تھیں اور اس عالم سفلی میں داخل ہوتی تھیں،
تیت کو دروازہ کے بالکل عقب میں دفن کیا گیا، تصویری حروف سے اس کے اصل نام
کے علاوہ اس کے عرفی نام تیت کا بھی علم ہوتا ہے، قدیم مصر میں عرفی ناموں کا چلن
عام تھا، ان میں سے بعض نام آج تک مصریوں میں رائج و مقبول ہیں اور ان میں تیت
بھی شامل ہے، مقبرہ کی داہنی دیوار پر ایک منقش و رنگین منظر میں، غلام دکھائے گئے
ہیں جو کھانوں کے برتن، شراب کی صراحیاں اور گوشت وغیرہ عمدہ پکوان اٹھائے ہوئے
ہیں جو تیت کی مابعد موت ضیافت کے لیے ہیں، یہ منظر اعلیٰ درجہ کی فنی مہارت کا نمونہ
ہے، اصلی رنگ میں خاص طور پر نیلا رنگ نہایت روشن ہے جو ایک باسکٹ کی تزئین
میں استعمال کیا گیا ہے، تصویری حروف سے تیت کے درجہ و مرتبہ کا تو علم ہوتا ہے لیکن
کسی عمدہ راز کی طرح وہ تشنہ ہے، تصویروں میں ہاتھر بھی ہے جو محبت اور عورت کی
دیوی تھی، یہ انجیر کے درخت کے نیچے بیٹھی دکھائی گئی ہے اور اس کے ارد گرد شاہزادیاں ہیں،

اندازہ ہوتا ہے کہ تیت کا درجہ ملکہ سے کم تھا کیونکہ تحریر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک فرعون کی ملکہ کی قبر کے سامنے رقص و غنا اور ساحرانہ منتروں کو پڑھنے والی مغنیہ و مطربہ تھی، گو یہ منصب نہایت اہمیت و وقار کا حامل تھا، لیکن ملکہ کے درجہ سے بہر حال فروتر تھا۔

آثار قدیمہ کے بعض برطانوی اور امریکی ماہرین نے حبش کے قدیم ترین تاریخی شہر اقسوم کے نزدیک کھدائی شروع کی ہے جس کا آغاز اقسوم کے قدیم فرمانروا بادشاہ روبایا کے مقبرہ کے پاس کیا گیا ہے یہیں اقسوم کا نہایت بلند مخروطی مینار بھی تھا جسے مسولینی نے ۱۹۳۶ء میں حبش کو فتح کرنے کے بعد تین حصوں میں توڑ کر روم بھجوا دیا تھا اور یہ بعد میں وہاں مسولینی کے نشان فتح کی علامت کی صورت میں نصب کیا گیا تھا۔ اقسوم کی اس تازہ ترین کھدائی کا مقصد یہ ہے کہ وہاں اس قدیم تہذیب کے آثار مل سکیں، جن کا تعلق ملکہ سبا کے عہد سے ہے۔

دنیا کی بیشتر زبانوں کا تعلق بھی قدیم تاریخ کے اس حصہ سے ہے جسکے متعلق جزم و یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا، لیکن غالباً تنہا کوریائی زبان ہی کے بولنے والوں کو اس کی تاریخ پیدائش کے صحیح علم کا دعویٰ ہے نومبر میں کوریا کی زبان ہنگول کو پورے ۵۴۸ سال ہو گئے، اس مہینہ کے ایک خاص دن کو وہ زبان کی سالگرہ کی حیثیت سے مناتے ہیں، اس دن انکی قومی تعطیل ہوتی ہے اور سمینار، نمائشوں اور ادبی انعامات کے ذریعہ ۲۸ حرفوں کی اس زبان کی یاد تازہ کرتے ہیں یہ زبان اس قدر آسان ہے کہ کوریا کا ہر شخص اس کو لکھ اور پڑھ سکتا ہے، مشہور ہے کہ ۹؍اکتوبر ۱۴۴۶ء کو کوریا کے بادشاہ سی جانگ نے یہ کہا تھا کہ با صلاحیت افراد اس زبان کو صرف ایک صبح میں سیکھ سکتے ہیں اور بلید و کند ذہن زیادہ سے زیادہ دس دنوں میں سیکھ لے گا، ۹؍اکتوبر ہی کو بادشاہ نے اس نو ساختہ زبان کے استعمال کا فرمان جاری کیا تھا، ہو سکتا ہے اسکے قول میں مبالغہ ہو کیونکہ کم از کم غیر ملکیوں کے لیے اسقدر کم مدت میں ہنگول زبان کے ۱۰ حروف علت اور ۱۴ حروف صحیحہ کی آوازوں کو نکالنا ممکن نہیں اس زبان کے جملوں کی ساخت ایسی ہے کہ افعال ان کے بالکل

معارف کی ڈاک

مکتوب لاہور

دفتر اردو دائرہ معارف اسلامیہ
پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔

۶؍ دسمبر ۱۹۹۴ء

مکرمی محترمی جناب اصلاحی صاحب

السلام علیکم۔ مزاج گرامی۔ پچھلے ہفتے ہمیں ترکیہ کے محکمہ اوقاف (ترکیہ دیانت وقفی) کی طرف سے ترکی انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (اسلام انسکلوپیڈیسی) کی دسویں جلد موصول ہوئی۔ اس جلد میں حرف "د" سے شروع ہونے والے اسماء و اعلام پر مقالات ہیں چونکہ رومن رسم الخط میں الف (ء) کو بھی E سے لکھا جاتا ہے، اس لیے اس میں عربی رسم الخط میں لکھے جانے والے وہ اسماء و اعلام بھی آگئے ہیں جن کی ابتداء الف (أ) سے ہوتی ہے، حسب معمول اس جلد کا رسم الخط بھی رومن حروف میں ہے، مگر عنوانات عربی میں ہیں۔ منتخب[1] اور چیدہ چیدہ مضامین کا تعارف حسب ذیل ہے۔

(۱) دینی شخصیات۔ حضرت ابو ایوب انصاری، حضرت ابو موسیٰ اشعری، حضرت ابو ذر غفاری، حضرت امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف، امام ابو داؤد سجستانی وغیرہ دینی شخصیات کے ذیل میں غیر معروف صحابہ اور تابعین کے حالات بھی مرقوم ہیں۔

---

[1] یہ تقسیم میں نے ذوقی اعتبار سے لکھدی ہے ورنہ تمام مشاہیر کے حالات ابجدی ترتیب سے لکھے گئے ہیں۔

(۲) علمی شخصیات۔ ابو حامد غرناطی (مشہور سیاح)، ابو فراس الحمدانی، ابو نواس شاعر، ابو حیان غرناطی (مفسر قرآن) ابو حیان توحیدی (فلسفی اور صوفی)، ابو نعیم الاصفہانی ابو طالب مکی، ابو تمام (شاعر) ابو عبید قاسم بن سلام، ابو یعلی الفراء، ابو العلاء المعری (شاعر) ابو الاسود الدؤلی (نحوی) اور ابو الفرج الاصبہانی، ابو الفداء (مورخ)، ابو مخنف (مورخ) افغانی (سید جمال الدین) وغیرہ۔

(۳) معروف کتابوں کے سلسلے میں مندرجہ ذیل کتابوں کا تذکرہ ہے:۔

درالحکام (ملا خسرو) الدرر الکامنہ (ابن حجر) الدرۃ الفاخرہ (الغزالی) درۃ التاج الدر المنثور (سیوطی) اجوبۃ الفاضلۃ (عبدالحئی فرنگی محلی) اکبر نامہ (ابوالفضل) ادب الدنیا والدین (ماوردی) ادب القاضی (خصاف) ادب الکاتب (ابن قتیبہ) ادب المفرد (امام بخاری)

(۴) مندرجہ ذیل اسلامی فرقے بھی مذکور ہیں:۔

اہل الھواء، اہل الحدیث، اہل الحق، اہل حرف، اہل القبلۃ، اہل الکتاب اہل الرائے، اہل السنۃ، اہل التوحید، اہل الحق والعقد وغیرہ۔

(۵) مندرجہ ذیل ہندوستانی ارباب علم پر مقالات ہیں۔

شاہ ابو علی قلندر، ابو معشر السندی (مولف مغازی وحدیث) ابو العلاء اکبر آبادی (نقشبندی نرنگ)، ابو الفضل علامی اکبر بادشاہ (جلال الدین) اور ابو الکلام آزاد۔

(۶) مقامات کے سلسلے کے مندرجہ ذیل شہروں پر مضامین ہیں۔

الابلہ۔ دومۃ الجندل، ادرنہ، استانبول اور اجمیر وغیرہ۔

مندرجہ بالا مقالات و مضامین وغیرہ کے علاوہ بیسیوں ترک اور ایرانی مشاہیر

کا تذکرہ ہے، جن کا ذکر موجب طوالت ہوگا۔ انکے لیے معارف کا ایک پورا شمارہ بھی کفایت نہ کر سکے گا۔ قلمی کتابوں اور تاریخی عمارتوں کی تصویریں نہایت دیدہ زیب ہیں۔

میں نے گزشتہ مکتوب میں حقوق العباد کے حوالے سے علماء کی غفلت کا ذکر کیا تھا تو یاد آیا کہ پچھلے دور (قبل از تقسیم ہند) میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمۃ نے حقوق العباد کی ادائیگی پر جتنا زور دیا تھا وہ اور کسی عالم سے نہ ہوسکا۔

میرے شہر ہوشیار پور (مشرقی پنجاب) میں بہت سے دیندار افراد بڑے دنوں کی چھٹیوں پر تھانہ بھون جایا کرتے تھے۔ میں ان سے پوچھا کرتا تھا کہ حضرت تھانویؒ کس بات کی زیادہ تاکید کرتے ہیں، جواب ملتا تھا کہ حقوق العباد کی ادائیگی پر۔ ہمارے ہاں میراث میں لڑکیوں اور بہنوں کو حصہ دینے کا دستور نہ تھا۔ حضرت تھانوی بیٹیوں اور ہمشیرگان کو شرعی حصہ دینے کی تاکید کرتے رہتے تھے۔ مغربی پنجاب میں تو بڑا لڑکا ہی باپ کے مرنے کے بعد سارے مال ومتاع اور جائیداد کا مالک بن جاتا تھا اور چھوٹے بھائی بہن منہ دیکھتے رہ جاتے تھے بعض مسلمان انگریزی عدالتوں میں دھڑلے سے یہ کہہ دیا کرتے تھے کہ ہم ترکے کی تقسیم میں رواج کے پابند ہیں، شریعت کو نہیں مانتے۔ حضرت تھانوی نے اس رسم بد کے خلاف پورے زور سے آواز اٹھائی۔ اللہ تعالیٰ انکے اور انکے مسترشدین کے درجات بلند فرمائے۔ اب قانونی طور پر اس ظلم اور ناانصافی کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ یہ خط خواہ مخواہ طویل ہوگیا ہے، جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

امید ہے کہ آپ بمعہ متعلقین خیر و عافیت سے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کا حامی وناصر ہو، دعاؤں میں یاد رکھیں۔ فقط والسلام   نیاز مند: شیخ نذیر حسین

مکتوب علی گڑھ

علی گڑھ

۹۴/۱۱/۲۵

مکرمی مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب! السلام علیکم

کل معارف (نومبر) موصول ہوا، آپ کے والد ماجد کے سانحہ ارتحال کی خبر پڑھکر بہت افسوس ہوا خدا انکی مغفرت فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ میں نے آج صبح کو قرآن پڑھکر حاجی صاحب مرحوم کی روح کو بخش دیا اور انکے لیے دعائے مغفرت کی۔

باپ کے سایہ کا سر سے اٹھ جانا بڑا سانحہ ہے خدا آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

مولانا عمیر الصدیق کا کالم "اخبار علمیہ" خوب تھا، ان کی تحریر التتمش پر بھی بہت شوق سے پڑھی ایک ترک اسکالر علی گڑھ آئے ہوئے تھے، پروفیسر محمد حبیب مرحوم نے انہیں اپنے شعبۂ تاریخ میں مدعو کیا اور انہوں نے بہت اچھا لکچر دیا، جانے پر حبیب صاحب نے ان سے اس بادشاہ کے نام کا صحیح تلفظ پوچھا، انہوں نے ایل تتمش۔ یہ پچیس تیس سال پہلے کی بات ہے اس وقت عام طور پر یہ بادشاہ التمش کہلاتا تھا۔ استفسار و جواب کا سلسلہ جاری رکھیے، میں بھی کبھی کچھ پوچھوں گا۔

مولانا عبدالسلام ندوی کے مکتوب کے سلسلے میں آپ نے بہت اچھا کیا کہ مکتوب الیہ مولوی عبدالباری صاحب پر نوٹ لکھدیا ورنہ عام طور پر سمجھا جاتا کہ یہ پروفیسر عبدالباری ندوی ہیں۔

سید صاحب علیہ الرحمۃ کے چار پانچ خط میرے پاس محفوظ ہیں، فرصت ملی تو تلاش کرکے آپ کو بھیجوں گا۔ یہ استاد مرحوم مولانا عبدالعزیز میمن کے نام ہیں۔

امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ والسلام

مختار الدین احمد

وفیات

ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی مرحوم

گذشتہ ستمبر میں اردو کے نامور استاذ، محقق و نقاد اور ماہر لسانیات جناب ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کا کراچی میں ۸۰ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

وہ بدایوں میں پیدا ہوئے، علی گڑھ یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی، رشید احمد صدیقی اور مولانا احسن مارہروی وغیرہ سے اکتساب فیض کیا اور رشید صاحب کے زیر نگرانی لکھنؤ کے دبستان شاعری پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے یہ اعزاز حاصل کرنے والے پہلے شخص تھے، بعد میں یہ مقالہ کتابی شکل میں متعدد بار شایع ہوا اور یہی ان کی شہرت کا اصل سبب بھی بنا، مضمون نگاری کا شوق زمانہ تعلیم سے تھا چنانچہ اسی زمانہ میں ان کے مضامین معارف کے علاوہ دوسرے رسالوں میں بھی شایع ہوئے، درس و تدریس کا سلسلہ بھی مسلم یونیورسٹی سے شروع ہوا، جہاں وہ شعبۂ اردو میں لکچرر مقرر ہوئے، بعد میں پاکستان بننے کے بعد وہ کچھ عرصہ لاہور کے اورینٹل کالج میں اور پھر کراچی یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے استاد ہوئے، ترقی اردو بورڈ کراچی کے معتمد ہوئے اور ریٹائر ہونے کے بعد کراچی یونیورسٹی میں پروفیسر ایمریٹس ہوئے، مضامین کثرت سے لکھے اور متعدد کتابیں بھی لکھیں، معلوم ہوا کہ انہوں نے خود نوشت سوانح بھی لکھے تھے جو رسالہ تہذیب میں قسط وار چھپتے رہے ہیں، لیکن غالباً ابھی کتابی شکل میں طبع نہیں ہوئے، سرسید احمد خاں کی اسباب بغاوت ہند کو بھی حواشی و تعلیقات کے ساتھ کراچی سے شایع کیا،

ان کے حسب ذیل مضامین معارف میں بھی شائع ہوئے۔ میرؔ کا فارسی کلام، میر حسن کی ایک نادر مثنوی رموز العارفین، محسن کاکوروی اور ان کی خصوصیات اور مناقب ذو النورین المعروف بہ بہارستان سخن وغیرہ، متانت اور سلاست کے علاوہ ان کی تحریریں وسعت مطالعہ، منطقی استدلال اور اعتدال کا نمونہ ہیں، قدیم مصادر ادب سے وہ واقف تھے اور ان سے متاثر بھی، علامہ شبلی کے طرز تحریر کا اثر بھی ان پر تھا اور وہ ان کی تحریروں سے استفادہ بھی کرتے تھے، پروفیسر کلیم الدین احمد کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں "کلیم صاحب نے مغربی ادب سے استفادہ کیا ہے، لیکن ان خیالات کو آئے ہوئے اردو میں زمانہ گزرا، مولانا شبلی شعر العجم کی جلد چہارم میں انہی مباحث کو تشریح اور تفصیل کے ساتھ لکھ چکے ہیں" ایک جگہ لکھا کہ "بار بار مولانا شبلی کا حوالہ ممکن ہے ناظرین پر بار گزرے اسلئے اس مرتبہ حالی کی طرف رجوع کرتے ہیں" میر تقی میر پر ان کی تحریریں مطالعۂ میر کے لیے نہایت مفید ہیں، میر کے وہ مرتبہ شناس تھے، لیکن اس کے باوجود انکا خیال تھا کہ خدائے سخن کے لقب کے مستحق میر سے بڑھ کر اقبال ہیں، اقبالیات میں ان کی دو کتابیں اقبال اور مسلک تصوف اور ملفوظات اقبال نمایاں ہیں، ان کا ایک اور بڑا کارنامہ چھ جلدوں میں اردو لغت کی تدوین ہے جس کے متعلق جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے معارف میں لکھا تھا کہ یہ ایک ایسا عظیم الشان کارنامہ ہے جس پر نہ صرف اردو زبان بلکہ علم و ادب کو بھی ناز ہو سکتا ہے، کاش یہ سلسلہ وہ مکمل کر دے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں دنیا کی طرح آخرت میں بھی کامیابی و سرخروئی عطا فرمائیں۔ آمین۔

جناب معین احمد علوی کاکوروی

چند دنوں پہلے خبر ملی کہ ۴ر جنوری کو کاکوری میں جناب معین احمد علوی وفات پاگئے، اِنّا لِلّٰہِ، وہ ستر برس کے تھے اور درس و تدریس کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد اپنے وطن میں ایک ذاتی مدرسہ کے ذریعہ تعلیم کی دولت عام کرنے میں کوشاں تھے، ان کی زندگی نسبتاً خاموشی و گمنامی کی تھی لیکن ان کے مقالات و مضامین اہل نظر میں قدر کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، معارف میں ان کے متعدد مضامین شائع ہوئے وہ دار المصنفین اور اس کے خدمت گزاروں سے بڑا تعلق رکھتے تھے اور یہاں کی کتابوں سے اپنے ذاتی کتب خانہ کو مزین بھی کیا تھا، بہرائچ کے قیام میں انہوں نے سالار مسعود غازی کے سوانحی ماخذ اور سید امیر ماہ بہرائچی کے متعلق مضامین لکھے انکا ایک اور عمدہ مضمون سلاسل و طبقات تصوف میں ایک مخطوطہ مراۃ الاسرار کے متعلق بھی معارف میں شائع ہوا، وہ اس دور میں کاکوری کی علمی و دینی روایتوں کے امین تھے اور اس مشہور مردم خیز قصبہ کی شرافت و مروت کی روایتوں کے وارث بھی تھے، مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی مرحوم کے حقیقی ماموں زاد بھائی تھے، اللہ تعالیٰ بال بال مغفرت فرمائے۔ آمین۔

ادبیات

قطعہ تاریخ وفات پروفسور رشید الظفر

رئیس دانشگاہ ہمدرد دہلی نو

از دکتر رئیس نعمانی، دہلی نو

روشن دل و بلند نگاہ و شگفتہ رو — افسوس آن رشید خجستہ گہر بمرد

مردی کہ بود مایۂ صد افتخار قوم — آن مرد فکر و دانش و صاحب نظر بمرد

محبوب مردم عرب و ناز اہل ہند — بیگانہ از فریب دل ہمد گر بمرد

می ماند تند قافلۂ علم و فن کہ حیف — مردی کہ بود راہنما در سفر بمرد

بزم جہان بہ تیرۂ "ہمدرد" تار گشت — آن شمع نور بار کہ پیش از سحر بمرد

واحسرتا کہ نیمہ شب آن چراغ ہوش — تابید آفتاب وش و چون شرر بمرد

تاریخ مرد نش دل محزون من رئیس

"باآہ" گفت: وای رشید الظفر بمرد"

۱۹۸۸
۶
———
۱۹۹۴م

کلیات شبلی

علامہ شبلی کی اردو نظموں کا مجموعہ جس میں مثنوی صبح امید اور قصائد کے علاوہ اخلاقی، سیاسی، مذہبی اور تاریخی نظمیں ہیں۔ قیمت ۲۵ روپے۔

"منیجر"

مطبوعات جدیدہ

شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی ایک سیاسی مطالعہ

از جناب ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری

متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۶۸، قیمت ۴۵ روپے،

پتہ، مکتبہ شاہد ۹ علی گڑھ کالونی، کراچی ۴۳، پاکستان۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کی ہستی علم وفضل زہد و تقویٰ اور بصیرت و فراست میں سلف صالحین کا نمونہ تھی، ان کے سوانح حیات متعدد اہل قلم نے مرتب کیے ہیں، زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس میں ان کے سوانح کے علاوہ ان کے چند سیاسی خطبات وفتاویٰ کو جمع کرکے ان کے سیاسی شعور و بصیرت کو خاص طور پر نمایاں کیا گیا ہے، شروع میں فاضل مولف کے قلم سے ایک پُر از معلومات مقدمہ بھی ہے، ایک جگہ لکھا گیا ہے کہ علی گڑھ سے جو گریجویٹ سب سے پہلے دینی تعلیم حاصل کرنے کے لیے دیوبند گئے، وہ برطانوی حکومت کے جاسوس تھے، مگر اس کے لیے کوئی مستند حوالہ نہیں دیا گیا ہے، ترکوں کی امداد کے سلسلہ میں حضرت شیخ الہند کے ایک فتوی کو نقل کیا گیا ہے، اس کے ضمن میں بے جا طور پر علامہ شبلی کے ایک فتویٰ کا ذکر کرکے یہ لکھا کہ "اسے علامہ کے شاگردوں نے ان کے ذوق فقہ اور فتویٰ نویسی میں بہت اچھالا، یہ لوگ شیخ الہند کے فتویٰ سے ناواقف تھے کیونکہ حضرت کے منتسبین۔۔تشہیر کے فن سے ناآشنا تھے"۔ اس فتویٰ کے متعلق یہ بھی لکھا گیا کہ "یہ مفتی

عزیز الرحمٰن کے قلم سے لکھا گیا تھا اور اس پر مولانا انور شاہ کشمیری کے دستخط بھی تھے لیکن یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اس فتویٰ میں رہنما حضرت ہی کا ذوق علمی تھا؛ تحقیق کا تقاضا یہ ہے کہ اس دعویٰ کی کوئی دلیل بھی دی جاتی۔ ایک باب میں شیخ الہند کے خطوط بھی جمع کر دیے گئے ہیں جو بار بار پڑھنے کے لائق ہیں، آیات کی کتابت میں مزید احتیاط کی ضرورت تھی۔

فکر اقبال کے سرچشمے از جناب ڈاکٹر آفاق فاخری، متوسط تقطیع عمدہ کاغذ، کتابت وطباعت، مجلد مع گردپوش، صفحات ۳۵۳، قیمت ۱۰۰ روپے پتہ: نصرت پبلشرز، حیدری مارکیٹ، امین آباد لکھنؤ۔ یوپی۔

علامہ اقبال کے مذہبی، سیاسی، تہذیبی اور فلسفیانہ افکار و خیالات کے مرجع و ماخذ کی تحقیق میں یہ لائق مولف کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہے، محنت و مطالعہ نے اس کتاب کو اقبالیات میں ایک عمدہ اضافہ بنا دیا ہے، اس کے ایک باب میں علامہ اقبال کی شخصیت، تعلیم اور اساتذہ اور ملکی و بین الاقوامی ماحول کے اثرات کی نشاندہی کی ہے اور پھر مختلف ابواب میں ان کے افکار و خیالات کی تشکیل و ارتقا کا جائزہ لیا ہے اور آخر میں یہ ثابت کیا ہے کہ علامہ کے ان خیالات میں سب سے نمایاں رنگ قرآن حکیم کا ہے جس کے چشمہ صافی پر پہونچنے کے بعد اقبال نے اپنی تمام ذہنی الجھنوں سے نجات حاصل کر لی، اقبالیات کے شیدائیوں کے لیے اس کتاب میں بڑا سامان کشش ہے۔

قصص و مسائل از مولانا عبد الماجد دریابادیؒ، چھوٹی تقطیع، کاغذ کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۱۶۰، قیمت ۱۲ روپے پتہ: الفرقان بک ڈپو، ۳۱ نیا گاؤں

ویسٹ نظیر آباد لکھنؤ۔ یوپی۔

مولانا عبد الماجد دریابادی مرحوم نے قرآن مجید کے بعض علمی، اثری اور تاریخی پہلوؤں پر رامپور اور پشاور کی علمی مجلسوں میں مقالات پیش کیے تھے جو ان کی زندگی ہی میں کتابی شکل میں شایع ہو گئے تھے اب اس طبع جدید میں ان مقالوں کے علاوہ ایک اور مضمون "تفسیر قرآن کے جدید تقاضے" کو بھی یکجا کر دیا گیا ہے، علوم القرآن کا ذوق رکھنے والوں کے لیے اس سے بہتر تحفہ کیا ہو سکتا ہے۔

ویدک دھرم اور اسلام از جناب مولانا سید اخلاق حسین دہلوی مرحوم، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت وطباعت، صفحات ۴۴، قیمت ۲۰ روپے پتہ: اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

ویدک دھرم کے آسمانی مذہب ہونے اور رام و کرشن کے برگزیدہ بندے ہونے کے متعلق مسلمان محققین نے ہمیشہ محتاط خیالات کا اظہار کیا ہے، بعض آثار و قرائن کے باوجود انھوں نے کوئی حتمی رائے بیان نہیں کی، اس کتاب میں یہی سوال زیر بحث ہے کہ ویدک دھرم کا آسمانی مذہب ہونا کہاں تک قرین قیاس ہے اور ویدوں اور شاستروں کا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں کیا مقام ہے؟ فاضل محقق مرحوم نے اپنے وسیع مطالعہ کی بنیاد پر نکتہ کی باتیں بیان کی ہیں، دلچسپ ہونے کے علاوہ ان کے دلائل میں غور و فکر کا سامان ہے، کتاب مختصر ہے مگر اپنے موضوع پر خاصی اہم ہے ہندوستان کے موجودہ حالات میں اس کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں۔

تصحیح اور تحقیق متن از جناب پروفیسر نذیر احمد، متوسط تقطیع، کاغذ اور کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۲۰۰، قیمت درج نہیں، پتہ: شعبہ اردو، بمبئی یونیورسٹی، بمبئی۔

مخطوطات اور قدیم و نایاب کتابوں کی ترتیب و تدوین میں سب سے اہم اور دشوار گزار مرحلہ ان کے متن کا تنقیدی مطالعہ اور پھر ان کی تحقیق و تدوین ہے گو اس سلسلہ میں چند اہم مضامین اور کتابیں شایع ہوچکی ہیں تاہم بحیثیت مجموعی وہ کافی نہیں اس ضرورت کے پیش نظر بمبئی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو نے اس موضوع پر توسیعی خطبہ کے لیے پروفیسر نذیر احمد کا انتخاب کیا، جن کی تحقیقی بلند پائیگی کا اعتراف عالمی طور پر کیا گیا ہے، اب ان کے نہایت عالمانہ اور مفید خطبہ کو شعبۂ اردو نے کتابی شکل میں شایع کر دیا ہے، اس کے لیے وہ مبارکباد اور شکریہ کا مستحق ہے۔

پروفیسر نثار احمد فاروقی

مرتب جناب خلیق انجم، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ اور عمدہ طباعت، مجلد، صفحات ۴۰۴، قیمت ۱۵۱ روپے، پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

اہل علم و ادب اور اصحاب تحقیق و تنقید کے لیے پروفیسر نثار احمد فاروقی کا نام محتاج تعارف نہیں، اردو کے علاوہ عربی و فارسی میں انکے دراسات و نگارشات اہل نظر سے داد تحسین حاصل کر چکے ہیں، وسیع اور متنوع مطالعہ اور قوت حافظہ کی نعمتوں سے وہ بہرہ ور ہیں، شہرت اور مقبولیت کی دولت حاصل ہونے کے باوجود احساس تفوق و پندار سے دور اور منکسر مزاج اور مرنجاں مرنج اور دلنواز شخصیت کے مالک ہیں، ماہنامہ کتاب نما نے ان کی خدمات کے اعتراف میں اپنا ایک خاص نمبر زیر نظر کتابی شکل میں شایع کرکے تحسین سخن شناس کی روایت میں اچھا اضافہ کیا ہے، اس میں مختلف اہل قلم کے تاثرات و احساسات کے علاوہ فاروقی صاحب کا ایک انٹرویو بھی شامل ہے، انکی تصنیفات و تالیفات و تراجم اور مضامین و مقالات کا مفصل اشاریہ بھی بڑے سلیقہ سے مرتب کیا گیا ہے۔

ع۔ ص۔